جلد ۹۷ جون ۱۹۸۲ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

- ○ جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- ● جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
- ○ جسے تحریکِ قیام پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- ● اِسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- ○ دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

- ● بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
- ○ اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل
- ● جہاد کے مخالفین و معترضین کا مسکت جواب
- ○ درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

۶۰۰ صفحات ○ قیمت : ۳۶ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن

اچھرہ ○ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۷	جون سنہ ۱۹۸۲ء مطابق شعبان سنہ ۱۴۰۲ھ	عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دعوت الی اللہ کی باتیں ان اوراق میں ہوتی رہی ہیں، مگر ایک سوال زیر بحث نہیں آیا۔ وہ یہ کہ داعیانِ حق کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ یوں تو داعیانِ حق کے کردار کا تصور اتنا وسیع ہے کہ اس میں ایک مومنِ متقی کے سارے ہی اوصاف آجاتے ہیں، خصوصاً قرآن نے اپنے انسانِ مطلوب کے جا بجا جو صفاتی خاکے پیش کیے ہیں اُن کو ہر اُس شخص کے لیے معیار بنانا لازم ہے جو خدا کی راہ میں کوئی دعوتی کام کرنا چاہتا ہو۔ یہاں ہم صرف چند ایسے اُمور کا ذکر کریں گے جو دعوتی لحاظ سے اُصولی اہمیت رکھتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ دعوت الی اللہ، شہادتِ حق یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارا کوئی ذاتی کام نہیں جسے ہم نے خود ہی سوچا ہو، اُس کی راہیں خود ہی تجویز کی ہوں اور اپنے مفاد اور جذبات کی ضروریات کے تحت اُس کے اُصول و مقاصد متعین کیے ہوں۔ یہ خدا کا اپنا کام ہے اور اسی نے اس کام کو کرنے کا اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے، اسی نے اس کے اُصول و مقاصد مقرر کیے ہیں، اسی نے اس کے لیے موزوں پیرایوں اور اسالیب کی نشاندہی کی ہے۔ پس اس کام کو جو لوگ کرنا چاہیں وہ نفسانیت سے اس معنی میں بھی پاک ہوں کہ وہ اپنی اُمنگوں اور جذبات کی تسکین کی فکر نہ کریں، اور اس لحاظ سے بھی پاک ہوں کہ وہ خدا و رسولؐ سے ہدایات لینے کے بجائے اپنے لیے خود ہی طور طریقے وضع نہ کرلیں۔ اجتہادی تدابیر کا میدان ہر شعبۂ کار میں شریعت نے رکھا ہے، مگر ایک تو اُصول و حدود واضح طور پر طے کر دیے ہیں اور دوسرے کسی ایسے اجتہاد کا کوئی جواز نہیں چھوڑا جو شرعی اُصول و حدود کے دائرے سے باہر نکل

جائے۔ گویا یہ مقام اخلاص کا مقام ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا کام اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر اللہ کے لیے کیا جائے۔ کام اگر اللہ کا نہ ہو تو بھی سب کچھ غارت، اللہ کے مقررہ طریقوں پر نہ ہو تو بھی عبث اور اللہ کے لیے نہ ہو تو بھی ہباءً منثورا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات وتلقینات تقاضا کرتی ہیں کہ جنھیں اللہ کا بتایا ہوا کارِ دعوت کرنا ہو وہ اللہ سے گہرا دلی رشتہ استوار کریں، اس کی عبادات پوری کریں، اس کے لیے حمد وثنا کریں، اس کا ذکر جاری رکھیں، اس کے سامنے بار بار اپنا دل کھول کر رکھیں، اپنی ناچیز خدمات کی قبولیت کی تمنا کریں، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اُس سے معافی مانگیں، اس کے لیے نوافل ادا کریں، اس کی راہ میں مال خرچ کریں، اُس کی مسجدوں سے لو لگائیں، اس کے بندوں کے لیے خادم بنیں اور یہ جانیں کہ دعوت الی اللہ سب سے بڑی خدمتِ خلق ہے۔ قرآن کو بار بار پڑھیں اور جو اُصولِ دعوت اس میں مذکور ہیں اور داعیانِ حق کی جو ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں اُن کو سمجھیں اور اختیار کریں۔ نیز انبیاء وصلحا کے نمونے کے کاموں سے روشنی لیں، احادیث اور سیرت کے مطالعے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ وصحابیات کی خدماتِ دعوتِ حق کا شعور وادراک پائیں، جن جن اُمور پر حضورؐ نے تربیتِ صحابہ کے دوران میں گرفت کی یا جن رویّوں کی اصلاح کی اُن کو الگ الگ رکھ کر سمجھیں۔ اس سلسلے میں ائمہ وعلما نے جو لٹریچر تیار کیا ہے، اُسے پڑھیں۔

خدا سے تعلق اگر اس طرح کا گہرا نہ ہو بلکہ دو چار سجدوں اور دس پانچ اجتماعات ہی پر سارا دارومدار رکھا جائے تو اندیشہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں سرگرم ترین داعیانِ حق کسی نہ کسی امتحانی مرحلے میں پھسل جائیں گے اور ایسی چوٹ کھائیں گے کہ کیا کرایا سارا درہم برہم ہو کے رہ جائے گا۔

خدا اور رسولؐ سے گہرا اور سچا قلبی تعلق رکھنے والا آدمی قرآن وحدیث کی کوئی بات سن کر موجودہ عدالتی نظام کے وکلا کی طرح بحثیں اور تاویلیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی کیفیت یہ ہوتی

ہے کہ "اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا وَجِلَتْ قُلُوْبُہُمْ" خدا کی آیات سُن کر سچے خدا پرستوں کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ اور وہ قرآن سُنانے والے سے اُلجھنے کے بجائے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں واقعی ہم سے کوئی خلاف ورزی تو نہیں ہوگئی۔ ایسے مواقع پر معاملہ اپنا دفاع کرنے کا نہیں ہوتا (اگرچہ کبھی کبھار اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے جب کہ بات کرنے والا قرآن کے منطوق کو صحیح نہ سمجھ رہا ہو یا وہ مخاطب کے متعلق غلط فہمی رکھتا ہو) بلکہ ضرورت اپنا احتساب کرنے کی ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسی مثالیں شاذ ہی شاید ملی ہوں کہ کسی نے آیت یا حدیث کو سُن کر یہ کہا ہو کہ میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اپنے موقف سے دستبردار ہوتا ہوں یا اس لمحے مجھ پر منکشف ہوگیا کہ فلاں معاملے میں میرا طرزِ فکر غلط تھا۔ آدمی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنا دفاع جھگڑالو ہونے کی حد تک کرتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت گہرے تعلق باللہ کی عدم موجودگی میں ہوتی ہے۔ داعیانِ حق کو خیال رکھنا چاہیے کہ قرآن کو ہماری دعوتی اور اجتماعی سرگرمیوں کے اوپر اوپر سے نہ گذر جانا چاہیے اور ہمیں اور ہمارے کام کو قرآن کی حقیقی برکات سے محروم نہ رہ جانا چاہیے۔

دعوتِ حق کے بیج سے یقیناً ایک سیاست بھی نمودار ہوتی ہے اور ایک نظام بھی پیدا ہوتا ہے، مگر فی نفسہٖ دعوت ایک سیاسی مشغلہ نہیں ہے۔ اور ہمارے ہاں تو خود سیاست بھی ایک دینی فریضہ ہے، لہٰذا سیاست بھی غیر سیاسی ہے۔ غیر سیاسی سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی خانقاہی سرگرمی ہے اور اس میں کشمکش کا کوئی دخل نہیں، بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ جس ذہنیت اور جس اسلوب سے دُنیا کے سیاست کار اور سیاست باز سیاست چلاتے ہیں وہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔ ہماری سیاست کا بھی اپنا ایک نہج ہے۔ ہماری سیاسی سرگرمی سے مقصود بھی رضائے الٰہی ہے جس کا معیاری مرتبہ حصولِ "لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ہاں تو اصل بات ہو رہی تھی دعوت کی ـــــ باوجودیکہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور کفر بالطاغوت کی دعوت کامل درجے کی سیاسی نوعیت رکھتی ہے، مگر اس کا طریقہ، فروغ سیاسی جدوجہد سے مختلف ہے۔ ہماری دعوت نعرہ بازی کا سلسلہ نہیں ہے، یہ کوئی دھونس جمانے کا ہتھیار نہیں ہے، بلکہ دعوت کا سارا کام معلّمانہ نوعیت کا ہے۔ سچا معلّم خلقِ خدا سے گہری محبت رکھتا ہے، وہ لوگوں کا بہترین خیر خواہ ہونے کی وجہ سے ان کی دُنیا

کو بھی سنوارنا چاہتا ہے اور اُن کی عاقبت کو بھی جیسے کہ پہلے کہا گیا۔ یہ اوّل درجے کی خدمت ہے۔ داعیِ حق جہاں بات ماننے والوں کو سینے سے لگاتا ہے، وہاں وہ نہ ماننے اور مخالفت کرنے والوں کو یہ الاؤنس دیتا ہے کہ اِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ انہیں اپنے بھلے بُرے کا پتہ نہیں ہے۔ اُن کی سمجھ سے ابھی تک یہ بات بالاتر ہے کہ خدا کے دین کا پیغام ان کو بیڑیوں اور بوجھوں سے نجات دلانے کے لیے ہے۔ وہ گالیاں دینے، استہزا کرنے اور ظلم ڈھانے والے مخالفین کے لیے بھی یہی سوچتا ہے کہ یہ لوگ سالہا سال سے باطل افکار اور غلط عادات رسوم کے جادو سے مسحور ہیں اور اس جادو کے ٹوٹنے میں دیر لگ سکتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس معلمانہ اور محبانہ کام میں صبر ایک شرط لازم ہے۔ اپنے صحیح کام پر اور اس کے اصولوں پر جمے رہنے کے لیے صبر چاہیے اور دوسروں کی زیادتیوں کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھانے کے لیے صبر چاہیے[1]۔ وہ لوگ جو دعوت کا معلمانہ کام کرتے ہوئے دوسروں کی فضول باتوں یا اُن کے مظالم پر اشتعال میں آجائیں اور مخالفین سے انتقام لینے لگیں، وہ اپنے متعلق ثابت کر دیتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طویل اور مردافگن مہم میں صحیح حصّہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مخالفین کی غلطیوں کو اپنی غلطیوں کے جواز کی دلیل بنانا داعیانِ حق کا کام نہیں ہے۔ داعیانِ حق میں اتنا ظرف ہونا چاہیے کہ وہ یاس انگیز مخالفانہ ماحول میں کبھی گھبرائیں نہیں، گھبرا کر جذباتی توازن نہ کھوئیں، مخالف افراد اور اداروں کے ذرائع و وسائل اور قوتوں سے مرعوب

---

[1] مرحلۂ جہاد کی بات کو بعض لوگ دعوت کی مہم پر منطبق کرتے ہیں، حالانکہ جہاد بہ معنی قتال ایک ایسی جماعت ہی کر سکتی ہے جس کی قیادت اغیار کی مداخلت سے آزاد ہو اور اس جہاد کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ کارِ دعوت کو اتمامِ حجت کی حد تک پہنچا دیا گیا ہو۔ پھر قتال محدود ہوتا ہے میدانِ جنگ تک۔ نہ یہ کہ جو بات نہ مانے وہ جہاں ملے اس کا سر اڑا دیا جائے۔

نہ ہوں، معاندوں کی اشتعال انگیز حرکات سے بارود کی طرح بھک سے اُڑ جائیں، بلکہ یقین رکھیں کہ خیر خواہی اور نیکی کے جذبے سے بے لوث کام کرنے والے جب تک مظلومی کے مقام پر رہتے ہیں اُن کا پیغام پھیلتا جاتا ہے اور اُن کے لیے ہمدردیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اُن کے لیے غیر جانب دار عناصر میں بھی اور خود مخالف گروہوں میں بھی ایک دھیمی دھیمی اور دبی دبی حمایت نشوونما پاتی رہتی ہے جو خاصی دیر میں کسی خاص موقع پر سامنے بھی آجاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر داعیانِ حق دسیوں سال صابرانہ کام کرتے کرتے کسی ایک موقع پر جارحانہ یا ظالمانہ اقدام کی تہمت کا نشانہ بن جائیں تو انہیں بہت بڑا نقصان پہنچتا ہے، خواہ وہ نقصان ابتدا ہی میں پوری طرح واضح نہ ہو۔ معلم اگر ایک بار انتقامیہ کا ڈنڈا حرکت میں لے آئے تو پھر محبت وخدمت کی بنا پر حاصل ہونے والی عزت وقیمت میں ایسی کمی آجاتی ہے جس کا پورا ہونا تا دیر مشکل ہوتا ہے۔ جب تک دعوت دینے کا کام کرنا ہو، مظلومانہ مقام پر رہ کر خوشی خوشی سے زخموں کو سینے سے لگائے رہیے۔ اور مظالم کے حسابات چکانے کا کام اللہ پر چھوڑ دیجیے (وعلینا الحساب) اور اگر " النفس بالنفس والسن بالسن" کے اصول پر آپ اپنے حسابات روز کے روز چکانا چاہتے ہوں تو پھر اسی کام میں لگے رہیے، دعوتِ حق کی علمبرداری کو دوسرے مناسب لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ داعی کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ، برسوں میں اس کا کردار ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے، اور وہ اپنے امتیازی خدوخال کے ساتھ پہچانا جانے لگتا ہے۔ اس کردار کا بنیادی ڈھانچہ صدق، دیانت اور عدل کی صفات سے بنتا ہے۔ اس کردار سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور اسے بغیر مسخ کیے برقرار رکھنا، شروع سے آخر تک صبر چاہتا ہے، مثلاً سچ بولتے بولتے اگر ایک بار ...... داعیٔ حق فرد یا گروہ جھوٹ بول دیتا ہے تو گویا وہ اپنے برسوں کے پرورش کردہ کردار کو خود ہی ایک ایسا زخم لگاتا ہے جسے کوئی مرہم مندمل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی برائیوں کے ساتھ اُن کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔

اور دوسروں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنے والے داعیوں کو خود اپنی غلطیوں پر زیادہ سختی سے گرفت کرنی چاہیے۔ دوسروں کا احتساب کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، مگر اپنا احتساب کرنا تو شرعی ذمہ داری ہے۔ ضمیر اگر زندہ ہو تو نہ اس کی آواز کو دبایئے اور نہ اس کے منہ میں مٹی ڈالیے بلکہ اس کی آواز کو اپنی آواز بنا کر اعتراف کرلیجیے کہ ہم سے غلطی ہوئی۔ اور جس کے حق میں غلطی ہوئی ہو اس سے معافی مانگ لیجیے۔ دنیا میں ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ کسی بڑی کوتاہی اور غلطی پر لوگ قیادت یا عہدوں سے مستعفی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے استعفیٰ بھی دراصل اس بات کا اعلان ہوتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔

عدل ہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی موقع بالفرض کسی کے ساتھ تصادم کا پیدا ہو ہی جائے تو کسی کی زیادتی کی جوابی کارروائی ہرگز اس کی زیادتی سے بڑھ کر نہ ہو۔ داعی کا اصل مقام تو معاف کرنا ہے، لیکن استثنائی طور پر کوئی ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے کہ کسی کی ظالمانہ حرکت کا دفاع کرنا پڑ جائے تو اصول یہ ہے کہ "فاعتدوا علیھم بمثل ما اعتدی علیکم" نیز قرآن کی یہ ہدایت بڑی جامع ہے کہ "وَلا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا" یعنی کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ اُکسا دے کہ تم انصاف ہی سے کام نہ لو۔

مختصر یہ کہ صدق، دیانت اور عدل پر صبر سے کاربند رہنا اہلِ دعوتِ حق کے لیے ضروری ہے۔

پانچویں بات یہ کہ دین کے ہر کام کی طرح دعوتِ اساسی کا کام بھی اس کام کے شرکا کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔ داعیانِ حق کو مشورے سے اپنے لیے دعوت کا منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ مشورے ہی سے ہر خاص مرحلے کی کارروائی کا فیصلہ ہونا چاہیے اور کام پر نکلنے سے پہلے ہدف مقصود اور طریقِ کار متعین ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ میدانِ دعوت کے شہسواروں کو پتہ ہی نہ ہو کہ آج وہ کس غرض سے نکلے ہیں۔ اور اچانک چلتے چلتے انھیں اشتعال آجائے اور پھر بے اختیارانہ طور پر ان سے بعض حرکات صادر ہو جائیں۔ یہ کام تو مجذوبوں کا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے وہ جب جو چاہیں کہہ دیں اور جو چاہیں کر بیٹھیں۔ ذی شعور اور

ہوش مند داعیانِ حق کا راستہ مجذوبوں کا راستہ نہیں ہے۔

چھٹی بات یہ کہ لفظ انقلاب کو بھی مشورے اور منصوبہ بندی کی کوتاہیوں کی ڈھال نہیں بنایا جا سکتا اور نہ انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ کام کرنے والے جو ہنگامہ چاہیں کھڑا کر دیں، سب روا ہے۔ انقلاب کے لفظ سے اس دور میں جو غیر اسلامی مطالب وابستہ ہو گئے ہیں، ہمارے دل و دماغ کو ان کے جنگل میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ اسلامی دعوت کے انقلابی ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ صرف وعظ نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی کا پیغام ہوتی ہے۔ اور تبدیلی بھی وہ فقط فرد کی زندگی میں نہیں چاہتی بلکہ اجتماعی نظام میں چاہتی ہے۔ لیکن اسلام کی انقلابیت یہ معنی نہیں رکھتی کہ کام کرنے کے نہ کوئی اصول ہیں، نہ حدود، نہ اخلاقیات اور نہ کسی مشورے کی ضرورت ہے، نہ تدبیر کی، نہ حکمت کی، نہ مصلحت کی، نہ منصوبہ بندی کی، اسلامی انقلابیت کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ داعیانِ حق جدھر چاہیں چڑھ دوڑیں اور جس کی گردن چاہیں ناپ دیں، اسلام کا داعی تو برسوں پس پس کر تبدیلی لانے کی قوت حاصل کرتا ہے۔

ساتویں بات یہ کہ اسلام کی خدمت کرنے کے لیے نوجوانی کا دور بہترین دور ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ نوجوان اپنی اُبلتی، اُمڈتی ہوئی ذہنی اور جذباتی قوتوں کو انضباط میں رکھ سکیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے، بالعموم نوجوان تھے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لانے والوں کو علاوہ اصحابِ کہف بھی نوجوان ہی تھے۔ حضورؐ کی تحریک کو بھی نوجوانوں ہی نے آگے بڑھایا۔ اور پورا اسلامی انقلاب نوجوانوں کی پوری ایک نسل کی قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن یہ سارے نوجوان ایسے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مرضیاتِ الٰہیہ میں جکڑ لیا تھا۔ حدیث میں خدا کی طرف سے ایسے ہر نوجوان کے لیے قیامت کے دن سایۂ عرشِ الٰہی میں جگہ دینے کا وعدہ ہے۔ جس کو حسب نسب (باقی بر صفحہ ۵۲)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

عالمِ اسلام اور تحریکاتِ اسلامی[1]

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ دُنیائے اسلام اس وقت دو بڑے حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک حصّہ وہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور سیاسی اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا حصّہ وہ جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور سیاسی اقتدار بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں حصّوں میں سے فطری طور پر زیادہ اہمیّت دوسرے حصّے کو حاصل ہے اور ملّتِ اسلامیہ کا مستقبل بہت بڑی حد تک اُس روش پر منحصر ہے جو آزاد مسلم مملکتیں اختیار کر رہی ہیں اور آگے اختیار کرنے والی ہیں۔ اگرچہ پہلا حصّہ بھی کچھ کم وزن نہیں رکھتا۔ اپنی جگہ اُس کو بھی بڑا اہم مقام حاصل ہے، کیونکہ کسی نظریۂ حیات اور عقیدہ و مسلک کے پیروؤں کا دُنیا کے ہر خطّے اور ہر گوشے میں پہلے ہی سے موجود ہونا، اور قلیل تعداد میں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہونا، اُن لوگوں کے لیے بڑی تقویت کا موجب ہو سکتا ہے جو اُس نظریے اور عقیدہ و مسلک کی علمبرداری کے لیے اُٹھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نظریہ اور عقیدہ و مسلک خود اپنے ہی گھر میں مغلوب ہو جائے تو رُوئے زمین پر پھیلے ہوئے اُس کے یہ پیرو، جو پہلے ہی سے مغلوب ہیں، زیادہ دیر تک اپنے مقام پر ٹھیرے نہیں رہ سکتے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اس وقت نظر بظاہر دُنیائے اسلام کے مستقبل کا انحصار اُن مسلم ممالک ہی کے

[1] عنوان اور ذیلی سرخیاں ہماری تجویز کردہ ہیں۔ (ادارہ)

مستقبل پر ہے جو انڈونیشیا اور ملایا سے کر مراکو اور نائیجیریا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کوئی اور کرشمہ دکھائے جس کا ہم ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ نہ کر سکتے ہوں۔ وہ چاہے تو چٹانوں سے چشمے پھوڑ کر نکال سکتا ہے۔ اور ریگستانوں کو اپنے ایک اشارے سے گلستانوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔

استعمار کی چیرہ دستیاں

اب اسی مفروضے پر کہ دُنیائے اسلام کا مستقبل مسلم ممالک کے ساتھ وابستہ ہے۔ ذرا اس امر کا جائزہ لیجیے کہ یہ ملک اس وقت کس حالت میں ہیں، اور جس حال میں یہ ہیں، اس کے اسباب کیا ہیں؟

آپ لوگ یہ جانتے ہیں کہ ایک طویل مدت تک ذہنی جمود، عقلی انحطاط، اخلاقی زوال اور مادی اضمحلال میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار اکثر و بیشتر مسلمان ملک مغربی استعمار کے شکار ہوتے چلے گئے تھے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی سے یہ عمل شروع ہوا تھا اور موجودہ صدی کے اوائل میں یہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے میں گنتی کے صرف دو چار مسلمان ملک باقی رہ گئے تھے جو براہِ راست مغربی مستعمرین کی سیاسی غلامی میں مبتلا ہونے سے بچ گئے، مگر پے در پے شکستیں کھا کھا کر اُن کا حال غلام ملکوں سے بھی بدتر ہو گیا۔ اور ان کی مرعوبیت اور دہشت زدگی اُن لوگوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی، جو اپنی سیاسی آزادی پوری طرح کھو بیٹھے تھے۔

مغربی استعمار کے اس غلبے کا سب سے زیادہ تباہ کن نتیجہ وہ تھا جو ہماری ذہنی شکست اور ہمارے اخلاقی بگاڑ کی شکل میں رونما ہوا۔ اگر یہ مستعمرین ہمیں لوٹ کر بالکل غارت کر دیتے اور قتلِ عام کر کے ہماری نسلوں کو مٹا دیتے تب بھی اتنا بڑا ظلم نہ ہوتا، جتنا بڑا ظلم انھوں نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے اخلاقی مفاسد پھیلا کر ہم پر ڈھایا۔ جن جن مسلمان ملکوں پر اُن کا تسلط ہوا وہاں اُن سب کی مشترک پالیسی یہ رہی کہ ہمارے آزاد نظامِ تعلیم کو ختم کر دیں، یا اگر وہ پوری طرح ختم نہ ہو سکے تو اس سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کے لیے حیاتِ اجتماعی میں کوئی مصرف باقی نہ رہنے دیں۔ اسی طرح یہ بھی اُن کی پالیسی کا ایک لازمی جزو رہا ہے کہ مفتوح قوموں کی اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے

باقی نہ رہنے دیں - اور ان کی جگہ فاتحین کی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بھی بنائیں اور سرکاری زبان بھی قرار دے دیں - مشرق سے مغرب تک تمام مغربی فاتحین نے بالاتفاق یہی عمل تمام مسلم ممالک میں کیا - خواہ وہ ڈچ ہوں یا انگریز یا فرانسیسی یا اطالوی یا کوئی اور - اس طریقہ سے ان مستعمرین نے ہمارے ہاں ایک ایسی نسل تیار کر دی جو ایک طرف تو اسلام اور اس کی تعلیمات سے ناواقف، اس کے عقیدہ و مسلک سے بےگانہ، اور اس کی تاریخ اور روایات سے نابلد تھی، اور دوسری طرف اس کا ذہن اور اندازِ فکر اور زاویۂ نظر مغربی سانچے میں ڈھل چکا تھا، پھر اس نسل کے بعد پے در پے دوسری نسلیں ایسی اٹھتی چلی گئیں جو اسلام سے اور زیادہ دور اور مغربی فلسفۂ حیات اور تہذیب و تمدن میں زیادہ سے زیادہ غرق ہو چکی تھیں ان کے لیے اپنی زبان میں بات کرنا موجبِ ننگ و عار اور فاتحین کی زبان میں بولنا موجب افتخار بن گیا - مغربی فاتح نصرانیت کے لیے خواہ کتنے ہی متعصب ہوں، ان فرنگیت مآب غلاموں کو مسلمان ہونے پر شرم آنے لگی اور اسلام کے خلاف بغاوت کا یہ فخریہ اظہار کرنے لگے - مغربی فاتح اپنی فرسودہ اور بوسیدہ قومی روایات کا کتنا ہی احترام کرتے ہوں، یہ غلام لوگ اپنی روایات کی تحقیر کرنا ہی اپنے لیے ذریعۂ عزت سمجھنے لگے - مغربی فاتحین نے مدت العمر مسلمان ملکوں میں رہنے کے باوجود کبھی مسلمانوں کے لباس اور طرزِ زندگی اختیار نہ کیے، مگر یہ غلام لوگ اپنے ہی ملکوں میں رہتے ہوئے ان فاتحین کے لباس، ان کے رہن سہن کے طریقے، ان کے کھانے پینے کے ڈھنگ، ان کی ثقافت کے اطوار، حتیٰ کہ ان کی حرکات و سکنات تک کی نقل اتارنے لگے اور اپنی قوم کی ہر چیز ان کی نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ گئی - پھر مغربی فاتحین کی تقلید میں ان لوگوں نے مادہ پرستی، الحاد، عصبیتِ جاہلیہ، قوم پرستی، اخلاقی بے قیدی اور فسق و فجور کا پورا زہر اپنے اندر جذب کر لیا، اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جو کچھ مغرب کی طرف سے آتا ہے - وہ سراسر حق ہے، اسے اختیار کرنا ہی ترقی پسندی ہے اور اس سے منہ موڑنے کے معنی رجعت کے سوا کچھ نہیں ہیں -

مغربی مستعمرین کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ جو لوگ اس رنگ میں جتنے زیادہ رنگ جائیں اور اسلام کے اثرات سے جس قدر زیادہ عاری ہوں، ان کو زندگی کے ہر شعبے میں اتنا ہی

زیادہ بلند مرتبہ دیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ سلطنتوں میں اونچے سے اونچے عہدے انہی کو ملے۔ مستعمرین کی فوجی اور سول ملازمتوں میں یہی کلیدی مناصب پر پہنچے۔ سیاست میں انہی کو اہم حیثیت حاصل ہوئی۔ سیاسی تحریکوں کے یہی لیڈر بنے۔ پارلیمنٹوں میں یہی نمائندے بن کر پہنچے اور مسلمان ملکوں کی معاشی زندگی پر بھی یہی چھاگئے۔

اس کے بعد جب مسلمان ملکوں میں آزادی کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں تو ناگزیر یہ تھا کہ ان تحریکوں کی قیادت یہی لوگ کریں، کیونکہ یہی حکمرانوں کی زبان میں بات کر سکتے تھے، یہی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اور یہی ان کے قریب تر تھے۔ اسی طرح جب یہ ممالک آزاد ہونے شروع ہوئے تو آزادی کے بعد اقتدار بھی انہی کے ہاتھوں میں منتقل ہوا اور مستعمرین کی خلافت انہی کو نصیب ہوئی، کیونکہ مستعمرین کے ماتحت سیاسی نفوذ و اثر انہی کو حاصل تھا، سول حکومت کا نظم و نسق یہی چلا رہے تھے اور فوجوں میں بھی قیادت کے مناصب پر یہی فائز تھے۔

چار قابلِ توجہ حقیقتیں

استعمار کے آغاز سے لے کر اس کے اختتام اور آزادی کی ابتدا تک کی اس تاریخ کے چند نمایاں پہلو ایسے ہیں جنہیں نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ انہیں نظر انداز کر کے اس وقت کی پوری صورتِ حال کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا جا سکتا۔

اوّل یہ کہ مغربی مستعمرین اپنی پوری مدتِ استعمار میں کسی جگہ بھی اس بات پر قادر نہیں ہو سکے کہ عام مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکیں۔ انہوں نے جہالت ضرور پھیلائی اور عوام کے اخلاق بھی بہت کچھ بگاڑ دیے، اور اسلامی قوانین کی جگہ اپنے قوانین رائج کر کے مسلمانوں کو غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی کوئی مسلمان قوم بھی من حیث القوم ان کے زیرِ اثر رہ کر اسلام سے باغی نہ ہو سکی۔ آج دنیا کے ہر ملک میں عام لوگ اسلام کے ویسے ہی معتقد ہیں جیسے تھے۔ وہ چاہے اسلام کو جانتے نہ ہوں مگر اسے مانتے ہیں اور اس کے ساتھ گہرا عشق رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہیں ہیں۔ ان کے اخلاق بری طرح بگڑ چکے ہیں اور ان کی عادتیں بہت خراب ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں اور نہ ان کے معیار جوں کے توں قائم ہیں۔ وہ سود اور زنا اور شراب نوشی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں، مگر چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں آپ کو ایسا کوئی شخص

نہ ملے گا جو ان چیزوں کو حرام نہ مانتا ہو۔ وہ رقص و سرود اور دوسرے فواحش کی لذتوں کو چاہے چھوڑ نہ سکتے ہوں مگر چھوٹی سی مغرب زدہ اقلیت کے سوا عامۃ المسلمین کسی طرح بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہی اصل ثقافت ہے۔ اسی طرح مغربی قوانین کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے اُن کی پشتیں گزر چکی ہیں۔ مگر اُن کے دماغ میں آج تک یہ بات نہیں اُتر سکی ہے کہ یہی قوانین برحق ہیں اور اسلام کا قانون فرسودہ ہو چکا ہے۔ مغرب زدہ اقلیت ان مغربی قوانین پر چاہے کتنا ہی ایمان لا چکی ہو، عام مسلمان قوم ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام ہی کے قانون کو برحق مانتی ہے۔ اور اس کا نفاذ چاہتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علماے دین ہر جگہ عوام کے قریب ہیں، کیونکہ وہ انھی کی زبان سے بولتے ہیں اور اسی عقیدہ و مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں، جس کے عوام معتقد ہیں، لیکن زمامِ اقتدار سے وہ کلی طور پر بے دخل ہیں، اور ایک مدت دراز تک دنیوی معاملات سے بے تعلق رہنے کے باعث اُن میں یہ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کر سکیں اور زمامِ اقتدار ہاتھ میں لے کر کسی ملک کا نظام چلا سکیں۔ اسی وجہ سے کسی مسلمان ملک میں بھی وہ آزادی کی تحریک کے قائد نہ بن سکے اور کہیں بھی آزادی کے بعد اقتدار میں وہ شریک نہ ہو سکے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں ایک مدت سے اُن کا کام بس وہ ہے جو ایک موٹر میں بریک کا ہوتا ہے۔ ڈرائیور مغربیت زدہ طبقہ ہے اور یہ بریک گاڑی کی رفتار کو تیز ہونے سے کچھ نہ کچھ روک رہا ہے، مگر بعض ملکوں میں بریک ٹوٹ چکا ہے اور گاڑی پوری سُرعت کے ساتھ نشیب کی طرف جا رہی ہے، اگرچہ اس کے چلانے والے اس غلط فہمی میں ہیں کہ وہ فراز پر چڑھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دُنیا میں جہاں بھی کسی مُلک میں آزادی کی تحریک اُٹھی اس کے قائدین اگرچہ وہی مغرب زدہ لوگ تھے، لیکن کسی جگہ بھی وہ عام مسلمانوں کو مذہبی اپیل کے بغیر نہ حرکت میں لا سکے اور نہ قربانیاں دینے پر آمادہ کر سکے۔ بلا استثنا ہر جگہ انھیں اسلام کے نام پر لوگوں کو پکارنا پڑا۔ ہر جگہ اُن کو خدا اور رسول اور قرآن ہی کے نام پر اپیل کرنی پڑی۔ ہر جگہ انھیں آزادی کی تحریک کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دینا پڑا۔ اس کے بغیر وہ

کبھی بھی اپنی قوم کو اپنے پیچھے نہ لگا سکتے تھے۔ اب یہ تاریخ عالم کی عظیم ترین غداریوں میں سے ایک بے نظیر غداری ہے کہ ہر جگہ آزادی حاصل کرنے کے بعد فوراً ہی یہ لوگ اپنے تمام وعدوں سے پھر گئے اور ان کا پہلا شکار وہی اسلام ہوا جس کے نام پر انہوں نے آزادی کا معرکہ جیتا تھا۔

چوتھی اور آخری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان لوگوں کی قیادت میں مسلمان ملکوں کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے وہ صرف سیاسی آزادی ہے۔ پچھلی غلامی اور اس آزادی میں فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو زمامِ اقتدار باہر والوں کے ہاتھ میں تھی، اب وہ گھر والوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے کہ جس ذہن کے آدمی جن نظریات اور اصولوں کے ساتھ پہلے حکومت کر رہے تھے اُسی ذہن کے آدمی انہی نظریات کے ساتھ آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ وہی نظام تعلیم جو مستعمرین نے قائم کیا تھا اب بھی چل رہا ہے، انہی کے نافذ کردہ قوانین نافذ ہیں اور آگے مزید قانون سازی اُنہی خطوط پر ہو رہی ہے، بلکہ مغربی مستعمرین نے مسلمانوں کے قانون احوالِ شخصیہ (پرسنل لا) پر جو دست درازیاں کرنے کی کبھی ہمت نہ کی تھی، وہ آج آزاد مسلم مملکتوں میں کی جا رہی ہے۔ تہذیب و ثقافت اور اخلاق و تمدن کے جو نظریات مستعمرین دے گئے ہیں، اُن میں سے کسی چیز کو بدلنا تو درکنار، آج یہ لوگ اپنی قوموں کو ان سے بھی زیادہ اُس تہذیب میں غرق اور اُن اخلاقی نظریات کے مطابق مسخ کر رہے ہیں۔ وہ قومیت کے مغربی نظریات کے سوا اجتماعی زندگی کا کوئی دوسرا نقشہ نہیں سوچ سکتے۔ اسی نقشے پر وہ مسلم مملکتوں کے نظام چلا رہے ہیں اور اس کی وجہ سے اُنہوں نے مسلمان قوموں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کے ذہنوں میں الحاد بس گیا ہے اور جہاں جہاں بھی انہیں اسے پھیلانے کا موقع ملتا ہے وہاں وہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اس حد تک خراب کرتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ خدا اور رسول اور آخرت کا مذاق اُڑاتی ہیں۔ اور اباحیت میں خود مستغرق ہیں اور اُن کی قیادت ہر جگہ مسلمانوں کے اندر فسق و فجور اور بے حیائی پھیلا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مغربی استعمار کے چاہے کتنے ہی دشمن ہوں، مغربی مستعمرین اُن کو دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان کی ہر ادا پر یہ مرنے مٹتے ہیں۔ اُن کی ہر بات کو یہ معیارِ حق سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہر کام کی یہ

نقل اُتارتے ہیں۔ اُن میں اور اِن میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ مجتہد ہیں اور یہ محض ائمہ مقلد۔ یہ اُن کی پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر ایک انچ بھی کوئی نیا راستہ نہیں نکال سکتے۔

مسلمانانِ عالم کی موجودہ حالت یہ چار حقائق جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں، ان کو نگاہ میں رکھ کر آپ دنیا کی آزاد مسلمان قوموں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں تو اِس وقت کی پوری صورتِ حال آپ پر واضح ہو جائے گی۔ دُنیا کی تمام آزاد مسلم حکومتیں اِس وقت بالکل کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ وہ اپنی اپنی قوموں کے ضمیر سے لڑ رہی ہیں۔ اُن کی قومیں اسلام کی طرف پلٹنا چاہتی ہیں اور یہ اُن کو زبردستی مغربیت کی راہ پر گھسیٹ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کہیں بھی مسلمان قوموں کے دل اپنی حکومتوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ حکومتیں اُس وقت مضبوط ہوتی ہیں جب حکمرانوں کے ہاتھ اور قوموں کے دل پوری طرح متفق ہو کر تعمیرِ حیات کے لیے سعی کریں۔ اِس کے بجائے جہاں دل اور ہاتھ ایک دوسرے سے نزاع وکشمکش میں مشغول ہوں وہاں ساری قوتیں آپس ہی کی لڑائی میں کھپ جاتی ہیں اور تعمیر و ترقی کی راہ میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوتی۔

اِسی صورتِ حال کا ایک فطری نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان ملکوں میں پے درپے آمریتیں قائم ہو رہی ہیں۔ مغربیت زدہ طبقے کی وہ چھوٹی سی اقلیت، جس کو مستعمرین کی خلافت حاصل ہوئی ہے۔ اِس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر نظامِ حکومت عوام کے ووٹوں پر مبنی ہو تو اقتدار اُن کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتا۔ بلکہ جلدی یا دیر سے وہ لازماً لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے گا، جو عوام کے جذبات اور اعتقادات کے مطابق حکومت کا نظام چلانے والے ہوں۔ اس لیے وہ کسی جگہ بھی جمہوریت کو چلنے نہیں دے رہے ہیں اور آمرانہ نظام قائم کرتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ فریب دینے کے لیے انہوں نے آمریت کا نام جمہوریت رکھ دیا ہے۔

ابتداءً کچھ مدت تک قیادت اس گروہ کے سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں رہی اور سول حکام مسلمان ملکوں کے نظم ونسق چلاتے رہے۔ لیکن یہ بھی اسی صورت کا حال کا ایک فطری نتیجہ تھا کہ مسلمان ملکوں کی فوجوں میں بہت جلدی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ آمریت کا اصل انحصار انہی کی طاقت پر ہے۔ یہ احساس بہت جلدی فوجی افسروں کو میدانِ سیاست میں لے آیا اور

انہوں نے خفیہ سازشوں کے ذریعے سے حکومتوں کے تختے اُلٹنے اور خود اپنی آمریتیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب مسلمان ملکوں کے لیے ان کی فوجیں ایک مصیبت بن چکی ہیں۔ اُن کا کام باہر کے دشمنوں سے لڑنا اور ملک کی حفاظت کرنا نہیں رہا بلکہ اب اُن کا کام یہ ہے کہ اپنے ہی ملکوں کو فتح کریں اور جو ہتھیار اُن کی قوموں نے اُن کو مدافعت کے لیے دیے ہیں، انہی سے کام لے کر وہ اپنی قوموں کو اپنا غلام بنالیں۔ اب مسلمان ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے انتخابات یا پارلیمنٹوں میں نہیں بلکہ فوجی بیرکوں میں ہو رہے ہیں۔ اور یہ فوجیں بھی کسی ایک قیادت پر متفق نہیں ہیں، بلکہ ہر فوجی افسر اس تاک میں لگا ہوا ہے کہ کب اُسے کوئی سازش کرنے کا موقع ملے اور وہ دوسرے کو مار کر خود اس کی جگہ لے لے۔ ان میں سے ہر ایک جب آتا ہے تو زعیم انقلاب بن کر آتا ہے اور جب رخصت ہوتا ہے تو خائن و غدار قرار پاتا ہے۔ مشرق سے مغرب تک بیشتر مسلمان قومیں اب محض تماشائی ہیں۔ اُن کے معاملات کے چلانے میں اب اُن کی رائے اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اُن کے علم کے بغیر اندھیرے میں انقلاب کی کھچڑی پکتی ہے اور کسی روز یکایک اُن کے سروں پہ اُلٹ پڑتی ہے۔ البتہ ایک چیز میں یہ سب متحارب انقلابی لیڈر متفق ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اُن میں سے جو بھی اُبھر کر اُوپر آتا ہے وہ اپنے پیش رو کی طرح مغرب کا ذہنی غلام اور الحاد و فسق کا علمبردار ہوتا ہے۔

اُمید کی روشنی

اِن تاریک حالات میں ایک روشنی موجود ہے، جس کے اندر دو حقیقتیں مجھے صاف نظر آ رہی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے الحاد و فسق کے ان علمبرداروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا ہے اور یہ خود ہی ایک دوسرے کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ متحد ہوتے تو ناقابلِ علاج مصیبت بن جاتے۔ مگر ان کا رہنما شیطان ہے اور شیطان کا کید ہمیشہ ضعیف ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری اہم حقیقت جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمان قوموں کے دل بالکل محفوظ ہیں۔ وہ ہرگز ان نام نہاد انقلابی لیڈروں سے راضی نہیں ہیں اور اس امر کے پورے امکانات موجود ہیں کہ اگر کوئی صالح گروہ فکر کے اعتبار سے مسلمان اور ذہنی قابلیتوں کے لحاظ سے قیادت کا اہل ہو تو آخر کار وہی غالب آئے گا اور مسلمان قومیں اس الحاد و فسق کی قیادت سے نجات پا جائیں گی۔

اس وقت کام کا اصل موقع ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے ایک طرف مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے اور دوسری طرف جن کے دلوں میں خدا اور رسولؐ اور قرآن اور آخرت پر ایمان محفوظ ہے۔ قدیم طرز کی دینی تعلیم پائے ہوئے لوگ، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اور علمِ دین کے لحاظ سے ان کے بہترین مددگار بن سکتے ہیں، مگر بدقسمتی سے وہ اُن صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں جو قیادت اور زمامِ کار سنبھالنے کے لیے درکار ہیں۔ یہ صلاحیتیں فی الحال صرف مقدم الذکر گروہ ہی میں پائی جاتی ہیں اور ضرورت ہے کہ اس وقت یہی گروہ آگے بڑھ کر کام کرے۔

کام کرنے والوں کے لیے مشورے

ان لوگوں کو جو مشورے مَیں دے سکتا ہوں۔ وہ مختصراً یہ ہیں:-

اوّلاً، ان کو اسلام کا صحیح علم حاصل کرنا چاہیے تاکہ اُن کے دل جس طرح مسلمان ہیں اسی طرح ان کے دماغ بھی مسلمان ہو جائیں اور یہ اجتماعی معاملات کو اسلامی احکام اور اُصولوں کے مطابق چلانے کے قابل بن جائیں۔

ثانیاً، ان کو اپنی اخلاقی اصلاح کرنی چاہیے تاکہ ان کی زندگیاں عملاً بھی اُسی اسلام کے مطابق ہو جائیں جس کو وہ اعتقاداً برحق مانتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قول اور عمل کا تضاد آدمی کے اندر نفاق پیدا کرتا ہے۔ اور باہر کی دُنیا میں اس کا اعتماد ختم کر دیتا ہے۔ آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اخلاص اور راست بازی پر ہے۔ اور کوئی ایسا شخص نہ مخلص ہو سکتا ہے، نہ مانا جاسکتا ہے۔ جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ آپ کی اپنی زندگی میں اگر تناقض ہوگا تو نہ دوسرے آپ پر اعتماد کریں گے اور نہ خود آپ کے دل میں اپنے اُوپر وثوق پیدا ہو سکے گا۔ اس لیے دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے والے تمام لوگوں کو میری مخلصانہ نصیحت یہ ہے کہ جن جن اُمور کے متعلق انھیں یہ علم حاصل ہوتا جائے کہ اسلام نے ان کا حکم دیا ہے اُن پر عامل ہونے کی اور جن کے متعلق انھیں معلوم ہوتا جائے کہ اسلام نے انھیں منع کیا ہے، ان سے اجتناب کرنے کی پوری کوشش کریں۔

ثالثاً، اُن کو اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اور تحریر و تقریر کی قوتیں اس کام پر صرف کر دینی چاہییں کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفۂ حیات پر تنقید کر کے اُس بُت کو پاش پاش کر دیں جس کی آج

دنیا میں پرستش کی جا رہی ہے اور اُس کے مقابلے میں اسلام کے عقائد اور اصول و مبادی اور قوانینِ حیات کی تشریح و تدوین ایسے معقول طریقوں سے کریں جو نسلِ جدید کے ذہن کو ان کی صحت کا یقین دلا سکے اور اُن کے اندر یہ اعتماد پیدا کر سکے کہ دَورِ حاضر میں ایک قوم اِن عقائد اور اصول و قوانین کو اختیار کر کے نہ صرف ترقی کر سکتی ہے بلکہ دوسروں سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ یہ کام جتنے صحیح خطوط پر جتنے بڑے پیمانے پر ہو گا اتنے ہی دعوتِ اسلامی کے لیے آپ کو سپاہی ملتے چلے جائیں گے۔ اور یہ سپاہی ہر شعبۂ حیات سے نکل نکل کر آئیں گے۔ اِس عمل کا سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہنا چاہیے، تاکہ ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی پیدا ہو جائے جو ایک مُلک کے نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لیے درکار ہیں۔ یہ عمل جب تک بتدریج اپنی انتہا کو نہ پہنچ جائے، آپ کسی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی مصنوعی طریقے سے وہ برپا ہو بھی جائے تو وہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔

رابعاً، دعوتِ اسلامی سے جتنے لوگ متاثر ہوتے جائیں، ان کو منظم ہونا چاہیے اور اُن کی تنظیم کو ڈھیلا اور سُست نہ ہونا چاہیے۔ نظم و ضبط اور سمع و طاعت کے بغیر محض ہم خیال لوگوں کا ایک بکھرا ہوا گروہ فراہم کر دینے سے کوئی کارگر طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

خامساً، اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو عوام میں اپنی دعوت پھیلانی چاہیے تاکہ عام لوگوں کی جہالت دُور ہو اور وہ اسلام سے واقف ہوں اور اسلام و جاہلیت کا فرق جان لیں۔ اس کے ساتھ انہیں عوام کی اخلاقی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور فسق و فجور کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دینا چاہیے جو فاسق قیادت کے ہاتھ سے مسلمان قوموں میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم فاسق ہو جانے کے بعد ایک اسلامی حکومت کی رعایا بننے کے قابل نہیں رہتی۔ عامۃ الناس میں فسق جتنا بڑھے گا، اُن کے معاشرے میں اسلامی نظام کا چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ جھوٹے، بددیانت اور بدکار لوگ نظامِ کفر کے لیے جتنے موزوں ہیں۔ نظامِ اسلامی کے لیے اتنے ہی غیر موزوں ہیں۔

سادساً، انہیں بے صبر ہو کر خام بنیادوں پر جلدی سے کوئی اسلامی انقلاب برپا کر دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ جو مقصود ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس کے لیے بڑا صبر

درکار ہے۔ حکمت کے ساتھ جانچ تول کر ایک ایک قدم اٹھائیے اور دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے خوب اطمینان کر لیجیے کہ پہلے قدم میں جو نتائج آپ نے اخذ کیے ہیں وہ مستحکم ہو چکے ہیں۔ جلد بازی سے جو پیش قدمی بھی ہوگی، اس میں فائدے کی بہ نسبت نقصان کا خطرہ زیادہ ہوگا۔ مثال کے طور پر فاسق قیادت کے ساتھ شریک ہو کر یہ امید کی جاتی ہے کہ شاید اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے گا اور کچھ نہ کچھ اپنے مقصد کے لیے مفید کام بھی ہو سکے گا۔ لیکن عملی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس لالچ سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، کیونکہ دراصل زمامِ امر جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی ہی پالیسی چلاتے ہیں اور ان کے ساتھ لگنے والوں کو ہر قدم پر ان سے مصالحتیں کرنی پڑتی ہیں، یہاں تک کہ وہ آخرکار بس ان کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلائیے۔ بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے، اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے، اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے، جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔

یہ چند کلماتِ نصیحت ہیں جو دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے والوں کے سامنے میں پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کی رہنمائی فرمائے اور ہمیں دینِ حق کی سربلندی کے لیے صحیح طریقے سے جد و جہد کرنے کی توفیق بخشے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(تحریر کردہ - ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ)

عقلِ وجدانی سے متعلق چند اعتراضات کے جوابات

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

یہاں ضروری ہے کہ عقلِ وجدانی سے متعلق چند شکوک اور اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں تاکہ خلش دور ہو اور ذہنوں کو یکسوئی حاصل ہو جائے۔ گذشتہ چند صدیوں سے مغرب میں جو نظامِ فکر فروغ پا رہا ہے وہ مادیت اور لادینیت کی بنیادوں پر پروان چڑھا ہے۔ وہ نظامِ فکر اس کائنات میں مستقل وجود صرف مادہ کا تسلیم کرتا ہے۔ دیگر تمام اشیاء کو مادہ سے ماخوذ اور مستنبط مانتا ہے۔ اس لیے ان تمام اشیاء کی حیثیت اس کے نزدیک ضمنی اور ذیلی ہے۔

—— لوائے زر (LAVOISIER -1743-1794) نے دعویٰ کیا ہے کہ مادہ غیر فانی ہے۔ البتہ یہ مختلف شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

—— ژول (JOULE - 1818 - 1889) نے دعویٰ کیا کہ توانائی بھی غیر فانی ہے۔ عقلِ حسی اور عقلِ قیاسی کو وہ مادہ سے مستنبط مانتے ہیں۔ عقلِ استدلالی کا وجود وہ مستقل بالذات نہیں مانتے۔

—— پاولاو (PAVLOV - 1849 - 1936) نے ذہن انسانی کو غیر مادی ماننے سے انکار کر دیا۔

واٹسن (WATSON 1878 - 1958) نے انسانی شعور کا انکار کر دیا۔ وہ خارجی کردار کو ہی انسان کا اصل کردار قرار دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ حاسّۂ مذہبی اور عقلِ وجدانی کو بھلا کیسے مان سکتے ہیں۔ وہ اس کو ایک عارضی کیفیت قرار دیتے ہیں، جو خارجی ماحول کی پیداوار ہے۔ خارجی ماحول سے دل میں داخل ہو گئی ہے، اس لیے اُن کے خیال کے مطابق جب خارجی ماحول میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو یہ حاسہ خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عارضی دارِدہ ہے۔

مادّیت کے پرستاروں کا یہ تجزیہ اور تبصرہ انیسویں صدی کے سائنس دانوں کی ترنگ تھی جو بیسویں صدی کے نصف اوّل تک جاری رہی۔ اُس وقت تک مادیت کا نظریہ اَنَا وَلَا غَیرِی کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ مادیت کے حصار میں شگاف واقع نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک ہر مظہرِ فطرت کی تعبیر و توجیہ مادیت کے نظریہ سے کی جاتی تھی، مگر اب بیسویں صدی میں وہ فضا باقی نہیں رہی۔ اب نہ مادّہ کا سابق تصور باقی ہے نہ مادہ کا دوام باقی ہے۔ بلکہ خود مادہ کا وجود ہی قابلِ ثبوت مسئلہ بن گیا ہے۔ آج کے سائنس دان کائنات کی اصل حقیقت شعور (MIND) کو مانتے ہیں اور مادہ کو شعور سے ماخوذ تصور کرتے ہیں۔

—— میکس پلانک (MAX PLANK — 1858 — 1947) کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس کائنات کی .... اصل حقیقت شعور (MIND) ہے۔ مادہ کا مستقل وجود نہیں ہے۔ مَیں مادّہ کو شعور سے ماخوذ سمجھتا ہوں۔

—— جیمس جینز (JAMES-JEANS — 1878 — 1947) کہتا ہے، میرا ذاتی رجحان اس نظریے کی طرف ہے کہ شعور کائنات کی اساسی حقیقت ہے اور یہ مادی کائنات شعور سے ماخوذ ہے۔

—— آئن سٹائن (EIN STEIN — 1879 — 1955) کہتا ہے۔ میری رائے میں نفس (PSYCHE) اور شعور (MIND) کائنات کی اساسی حقیقتیں ہیں۔

—— ایڈنگٹن (EDDINGTON — 1882 — 1944) ۔مَیں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ انسان کی باطنی ایغو (EGO) مادّی کائنات کا ہرگز جزو نہیں ہے۔

—— شروڈنگر (SCHRODINGER — 1878 —) کہتا ہے شعور انسانی کی کوئی توجیہ طبعی طریقوں سے ممکن نہیں ہے۔

ہال ڈین (J.B. HALDANE — 1892-) کہتا ہے "شعور انسانی کی حیاتیاتی توجیہہ کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں۔
(ماخوذ از مذہب وسائنس۔ از عبدالباری ندوی ص ۱۹۹۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور۔ ۱۹۷۴ء)
علامہ اقبال کہتے ہیں " اسلام کے نقطہ نظر سے مادہ روح کی اُس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید زمان و مکاں میں ہوتا ہے۔ مغرب نے مادہ اور روح کی تقسیم کا تصور مادیت کے زیر اثر بلاکسی تجربہ کے قبول کر لیا ہے (خطبہ صدارت۔ سالانہ اجلاس مسلم لیگ منعقدہ الہ آباد۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء)
ایک شعر میں انہوں نے روح اور مادہ کی وحدت کو بڑے لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔

ارتباط حرف و معنی، اختلاط جان و تن

اور بہت پہلے عبدالقادر بیدل کہہ گیا ہے۔

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود

مادیت کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے۔ اب یہ بات واضح ہے کہ شعور کا مظہر عقل ہے۔ اس لیے عقل کا وجود نہ عارضی ہے اور نہ غیر حقیقی جیسا کہ اہلِ فرنگ کا دعویٰ ہے۔
حاسۂ مذہبی یا عقلِ وجدانی ہرگز ماحول کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ انسانی فطرت میں ودیعت کردہ جذبہ ہے۔ اِسی طرح جذبۂ عبودیت نوع انسانی کا فطری جذبہ ہے۔ کوئی بشر اس جذبے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے فطری اور طبعی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ مگر انیسویں صدی کے ماہرینِ نفسیات نے لادینیت کے چکر میں پھنس کر جذبۂ عبودیت کے فطری ہونے کا انکار کر دیا۔ وہ اس کو عارضی اور ماحول کا اثر قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کو انسانی جبلتوں (INSTINCT) میں شمار نہیں کرتے۔ جبلت کی تعریف میک ڈیگرط وغیرہ نفسیات دانوں نے یہ مقرر کی ہے کہ انسانی زندگی کا وہ محرکِ عمل جذبہ جس کی اصل عالم حیوانات میں موجود ہو۔ اس تعریف کی رو سے کھانا، پینا، لڑنا جھگڑنا، شہوت رانی کرنا وغیرہ تو فطری داعیہ اور

جبلت قرار پائے کیوں کہ ان کی نظیریں حیوانوں میں موجود ہیں۔ لیکن جذبہ عبودیت کو جبلت سے خارج کر دیا۔ کیونکہ یہ فعل حیوانات میں نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ ساری بحث اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان درحقیقت ایک عام حیوان ہے۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی درست نہیں ہے۔ انسان حیوانات سے اشرف اور اعلیٰ ایک مستقل بالذات مخلوق ہے۔ انسانی جبلت اس جذبہ کو قرار دیا جائے گا جو تمام نوع انسانی میں مشترک ہو، کوئی فرد بشر اس جذبے سے خالی نہ ہو۔ اس تعریف کی رو سے عبودیت بالکل فطری جذبہ ہے۔ دنیا میں انسانوں کا کوئی معاشرہ ایسا نہیں گذرا، جس میں اس جذبہ کا اظہار نہیں ہوا۔ بالفرض اگر چند افراد اس جذبے سے محروم ہیں یا بے حس ہیں تو اس کو انحراف (PERVERSION) قرار دیا جائے گا۔ اور انحراف خود اس جذبہ کے وجود کا دقیع ترین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حاسہ مذہبی کی آفاقیت اور عالمگیریت اس کے فطری اور حقیقی ہونے کا واضح ترین ثبوت ہے۔ اس کا انکار کرنا گویا حقیقت کو جھٹلانا ہے۔

حاسہ مذہبی کا تاریخی ثبوت اس صدی میں اشتراکی روس نے فراہم کیا ہے۔ گذشتہ ساٹھ پینسٹھ سال سے روس میں اشتراکی حکومت قائم ہے۔ جو برملا خود کو عدو اللہ (ANTI-GOD) کہتی ہے۔ اس نے حکومت کے تمام ذرائع اور وسائل انکار خدا، تردید مذہب، الحاد اور دہریت کی ترویج اور اشاعت میں لگا رکھے ہیں۔ مذہب کے خلاف ایک جارحانہ انداز کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے الحاد اور دہریت کو لوگوں کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پینسٹھ سال کی ان تھک جدوجہد کے بعد بھی روسی حکومت وہاں کے باشندوں کے دلوں سے جذبہ عبودیت فنا کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ تین چار نسلیں الحاد کی تربیت گاہ میں پرورش پانے کے باوجود جذبہ عبودیت کو نہیں مسل سکی ہیں۔ قطع نظر اس بحث سے کہ قدیم مذاہب کو وہ کس قدر ترک کر چکے ہیں، جذبہ عبودیت کے اظہار کے لیے انہوں نے نئے بت تراش لیے ہیں۔ اظہار عبودیت بدستور باقی ہے البتہ مرکز عبودیت میں فرق آگیا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۳۹)

نظریۂ تقادم اور اسلامی شریعت

ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

پاکستان میں ۱۹۷۷ء کی تحریک نظامِ مصطفیٰؐ میں یہ شعور و ادراک متاعِ گم گشتہ کی تلاش کا ایک شوقِ فراواں بن کر ابھرا، اور اس شوق کے مظاہر افقِ وطن پر طلوع بھی ہوتے، چنانچہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ کو اسلامی حدود کے نفاذ کا اعلان ہوا - اور بالآخر مقدمات حدود کی سماعت کے لیے وفاقی شرعی عدالت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی -

نظریۂ تقادم کیا ہے مقدماتِ حدود کی سماعت کے دوران مؤقر عدالت میں یہ مسئلہ بھی زیرِ غور آیا کہ اگر ان مقدمات میں شہادت نامناسب تاخیر کے ساتھ عدالت کے سامنے لائی جائے تو کیا یہ ایسا شبہ نہیں بن جاتی جو حد کے اسقاط میں مفید ہو - فقہ اسلامی میں اس صورتِ حال کو " تقادم " " تاخیرِ شہادت " " اثباتِ حق میں تاخیر " اور " جرم کے ثبوت کی فراہمی میں تاخیر " کے عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے - لیکن ایک قانونی اصطلاح کے طور پر " تقادم " ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے ، اس لیے ہم بھی اس تحریر میں آگے تمام مقامات پر تقادم کا ہی لفظ استعمال کریں گے -

انگریز کی غلامی کا داغ ہماری پیشانیوں پر تاہنوز باقی ہے - ہمارے ملک میں ۱۹۰۸ء کے قانونِ میعاد (LIMITATION ACT) بھی موجود ہے - اور آج تک نافذ العمل بھی ہے - مگر میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ قانون فقہ اسلامی کے نظریۂ تقادم کی بہ نسبت انتہائی محدود ہے اور فقہ اسلامی کا نظریۂ تقادم اس قانون سے زیادہ جامع زیادہ مکمل

اور زیادہ عملی افادیت کا حامل ہے۔ سب سے بڑا فرق اُس تصوّر کا ہے جو ان دونوں میں کارفرما ہے۔ "قانونِ میعاد" ایک حاکم قوم کا قانون ہے، جو اُس نے اپنی غلام اور محکوم قوم کے حقِ حصولِ انصاف پر تحدیدات (LIMITATIONS) عائد کرنے کے لیے بنایا تھا تاکہ غلام قوم کے افراد حاکم قوم کے منصفین کے پاس اپنے غیر ضروری اور زائد المیعاد معاملات لے جاکر معزز منصفین کا وقت ضائع نہ کریں۔

جب کہ فقہ اسلامی کے نظریۂ تقادم میں یہ جذبہ کہیں نظر نہیں آتا کہ مسلمان رعایا بلا وجہ اور غیر ضروری طور پر اسلامی عدالت کے فاضل قضاۃ کو تنگ نہ کریں، بلکہ اُس میں یہ روح کارفرما نظر آتی ہے کہ جس حد تک بشرطِ جواز ممکن ہو، اسلامی ریاست کے شہریوں کو سزا سے بچایا جائے، اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان پر عمل کیا جائے کہ:۔

اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ (جہاں تک ممکن ہو شبہ کی صورت میں حد ساقط کردو)۔

تقادم میں یہ جذبہ نظر آتا ہے کہ ہر ممکن طریقے پر اسلامی ریاست کی عدالتیں شہریوں کی جان و مال کا تحفظ کریں۔ اور اُن کے فیصلے شہریوں کے انفرادی اور اجتماعی مفادات میں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریۂ تقادم جب چوری کے جرم میں جاری ہوتا ہے تو چور قطعِ ید (ہاتھ کٹنے) کی سزا سے بچ جاتا ہے۔ لیکن عدالت اس امر کی بھی پابند ہوتی ہے کہ اگر جرمِ سرقہ ثابت ہو جائے تو چور سے مسروقہ مال مسروق منہ (جس کا مال چوری ہوا ہے) کو دلوایا جائے۔ اس طرح نظریۂ تقادم نے ایک جانب چور کو ہاتھ کٹنے سے بچایا، دوسری جانب جس کا مال چوری ہوا تھا، اُس کو اُس کا مال واپس دلوایا اور تیسری جانب مسروق منہ کی لازمی نفسیاتی تشفی اور سارق کو جرمِ سرقہ سے آئندہ احتراز کرنے کے لیے اس پر سزائے تعزیر عائد کی۔ اور بلاشبہ یہ تینوں پہلو اسلامی ریاست کے شہریوں کے مفاد میں ہیں۔

تقادم اور فقہی نقطہ ہائے نظر فقہ اسلامی میں تقادم کے معنی یہ ہیں کہ:۔

۱۔ ارتکابِ جرم کے بعد آنے والی شہادت میں بلا ضرورت قابلِ لحاظ تاخیر ہو جائے اور

عدالت کے سامنے یہ شہادت یا بیّنہ تاخیر سے پیش کیا جائے[1]
۲۔ عدالت میں ایک جرم ثابت ہو جانے اور اس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد نفاذ سزا میں قابلِ لحاظ تاخیر ہو جائے۔

قصاص و دیت کے مقدمات میں تقادم نہیں ہے، کیونکہ قصاص حق العبد ہے، اور حقوق العباد مدّت کے گذرنے سے ساقط نہیں ہوتے۔ البتہ جرائم حدود میں سے تین حدود حدِ زنا، حدِ سرقہ اور حدِ خمر — میں تقادم کو تسلیم کیا گیا ہے[2]۔

تقادم کے مسئلہ میں خاصا فقہی اختلاف ہے۔ یعنی حدود ثلاثہ (زنا، سرقہ، شرب) میں فقہائے احناف کے نزدیک تقادم حد کو ساقط کر دینے والا شبہ ہے۔ جب کہ فقہائے ثلاثہ کے نزدیک حدود میں تقادم شرط نہیں ہے۔ البتہ تعزیرات میں تمام فقہاء کے نزدیک شرط ہے۔

اس فقہی اختلاف کی توضیح علامہ ابن الہمام نے چار اقوال کی صورت میں کی ہے اور فقیہہ عصر ابو زہرہ نے بھی ان آراء کو بیان کیا ہے۔

پہلی رائے تقادم کا اصول تمام حدود میں جاری ہوگا، یعنی اگر کسی جرم حد کے ارتکاب کے بعد اس کی شہادت کے عدالت کے سامنے پیش ہونے میں مقررہ مدت گزر جائے، درآنحالیکہ اس مدت میں مشاہد کے لیے شہادت دینا ممکن ہو تو یہ شہادت قابلِ رد ہوگی۔ جب کہ امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ شہادت رد ہو جائے گی لیکن اقرار (اعتراف) ماسوائے حدِ شرب کے قبول ہوگا۔ یعنی حدِ شرب میں اعتراف کی صورت میں بھی تقادم ہے جو کہ منہ سے بُو چلے جانے کی مدت ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ منہ سے شراب کی بُو ختم ہو جانے

---

[1] — ڈاکٹر عبدالعزیز، التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ، ص ۵۲۰، مصر۔
— ابو زہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، ص ۵۲۵، مصر۔
— عبدالقادر عودہ، التشریع الجنائی الاسلامی جلد ۱، ص ۷۷۸، مصر۔
[2] — الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع جلد ۷، ص ۴۶، مصر

کے بعد اگر کوئی شخص عدالت کے سامنے یہ اعتراف کرے کہ اس نے فلاں وقت شراب پی تھی تو اس پر حدِ شرب جاری نہیں ہوگی، البتہ وہ مستحق تعزیر متصوّر ہو سکتا ہے۔

دوسری رائے (مقدماتِ حدود میں) شہادت (بصورت تقادم) رد ہو جائے گی اور اقرار بہر صورت قابلِ قبول ہوگا۔ یہاں تک کہ حدِ شرب میں بھی قابلِ قبول ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام ابو یوسف کی رائے ہے۔ کیونکہ اقرار میں تاخیر سے شبہ پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ کوئی شخص اپنی ذات کا دشمن نہیں ہوتا۔ اس لیے اقرار میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے اس کی قوتِ اثباتِ جرم کم نہیں ہوتی، کیونکہ اقرار میں تاخیر کسی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے مقر کو تردد ہو کہ میں اقرار کروں یا نہ کروں، لیکن بعد میں وہ خدا ترسی کی بنا پر اقرار کا فیصلہ کر لے۔

تیسری رائے شہادت میں تاخیر (تقادم) ہو یا اعتراف (اقرار) میں کسی بھی صورت میں یہ تاخیر مانعِ حد نہیں ہے، اس لیے یہ تاخیر شبہ پیدا نہیں کرتی، کیونکہ قولِ حق میں تاخیر اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں بنتی۔ یعنی شہادت یا اقرار میں تاخیر اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ شہادت یا اقرار باطل ہے اور بایں صورت یہ تاخیر ایسا شبہ نہیں بنتی جس سے حد ساقط ہو جائے۔ یہ امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے ہے۔

چوتھی رائے شہادت یا اقرار کی تاخیر تمام جرائم سرقہ، زنا اور شراب کے اثبات میں شبہ پیدا کر تی ہے۔[2]

خلاصہ ہم ان چاروں اقوال و آرا کو تلخیص کے ساتھ حسبِ ذیل دو نظریات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں۔

پہلے نظریہ کی اساس امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کی رائے پر قائم ہے کہ سزائے حد کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی، خواہ شہادت عدالت کے سامنے پیش

---

[1] — امام ابن الہمام، فتح القدیر جلد ۴، ص ۱۶۴، مصر۔

[2] — ابو زہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی ص ۲۲۵، مصر۔

کیے جانے میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے اور سزا جاری نہ ہو، نیز یہ کہ عدالتی کارروائی کے آغاز میں خواہ کتنی ہی تاخیر ہو جائے، جرم ساقط نہیں ہوتا۔

البتہ اگر ملکی مصالح اور مصالح عامہ اس امر کی مقتضی ہوں کہ تقادم کو تعزیرات اور جرائم تعزیرات کے ساقط ساقط کر دینے والا شبہ قرار دے دیا جائے تو عدالتوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ تعزیرات کی حد تک تقادم کو مانع سزا یا مانع (اثباتِ جرم) قرار دے سکتی ہیں۔

بہر حال اس امر کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے کہ تقادم شہادتِ جرم کے اثبات پر اثر انداز ہوتا ہے یا یہ کہ یہ تاخیر حد کو ساقط کر دینے والا شبہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن و سنت میں ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے (ماسوا اس اثر کے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے) اس لیے کہ حدود حق اللہ ہیں۔ اور اولوالامر یا عدالت یا مدعی علیہ کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اس سزا کو ساقط کر دے یا جرم کو ساقط کر دے[1]

دوسرے نظریہ کی بنیاد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے اصحاب کی اس رائے پر قائم ہے کہ تقادم یا تاخیرِ شہادت قصاص و دیت اور قذف کے جرائم کے اثبات پر اور ان جرائم کی سزاؤں کے اجرا پر اثر انداز نہیں ہے۔

جب کہ حدودِ ثلاثہ —— زنا، سرقہ، شرب خمر کے اثبات میں اور تمام تعزیرات میں تقادم اثر انداز ہوتا ہے۔

حقوق العباد میں تقادم مانع نہیں ہے۔ اس لیے حدِ قذف میں تقادم اثر انداز نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں حق العبد (یعنی جس شخص کی ذات پر قذف سے عار آیا ہے اس عار کو دُور کرنا) موجود ہے اور نیز اس لیے کہ قذف میں (مقدمہ کی سماعت اور اجرائے حد کے لیے مدعی کی جانب سے) دعویٰ شرط ہے۔ اس لیے تاخیر شہادت انعدامِ دعویٰ متصور ہوگی۔

فقہائے احناف سے امام زفر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس رائے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ

---

[1] عبدالقادر عودہ: التشریع الجنائی الاسلامی جلد ۱، ص ۷۷۸، مصر۔

ائمہ ثلاثہ کے ہم نوا ہیں۔[۱]

نظریۂ تقادم کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ کی رائے کی توثیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جرم حد دیکھنا کی ایک شرط عدم تقادم ہے اور یہ عدم تقادم حدود ثلاثہ — حد زنا، حد سرقہ اور حد شرب خمر — میں مشروط ہے جب کہ حد قذف شرط نہیں ہے۔

حدود ثلاثہ اور قذف میں فرق

حدود ثلاثہ اور قذف میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ شاہد (گواہ) جب مشاہدہ جرم کرتا ہے تو اس کے سامنے از روئے شریعت دو راستے ہوتے ہیں:۔ یا تو خالصتاً اللہ فوری طور پر گواہی دے کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے کہ "وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ" (اور قائم کرو شہادت کو اللہ کے لیے)۔ یا اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرلے کہ فرمان نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: "مَنْ سَتَرَ عَلٰی مُسْلِمٍ سَتَرَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ"[۲] (جس نے اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کی اللہ روز قیامت اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا)۔

(باقی)

---

۱ — عبدالقادر عودہ، التشریع الجنائی الاسلامی جلد ۱، ص ۷۷۸، مصر۔

— اللباب للمیدانی، جلد ۳، ص ۵۸۔

— حاشیۂ ابن عابدین، جلد ۳، ص ۱۸۲، ۱۸۳۔

— الکاسانی بدائع الصنائع، جلد ۷، ص ۴۶، ۴۷۔

— عبدالعزیز عامر، التعزیر فی الشریعۃ الاسلامیہ۔

۲ — ابوزہرہ: الجریمہ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، ص ۴۶۔

بحث و نظر

سر ڈھانپنے کا مسئلہ

جناب مولانا سید محمود حسن صاحب

محترم محمد امین صاحب نے ماہ اپریل ۱۹۸۲ء کے ترجمان القرآن میں میرے مضمون "ایک فراموش شدہ سنت" پر تنقید کی ہے۔ میں نے اسے غور سے پڑھا ہے، اُن کی اصولی باتوں سے مجھے کسی حد تک اتفاق ہے، میں ان باتوں سے ناواقف نہیں ہوں۔ لیکن تمام معاشرتی اُمور پر اُن کے انطباق میں ان سے خلط مبحث ہو گیا ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے پیراگراف نمبر ۳ میں جو دیہی معاشرے کی مثال دی ہے، وہ زیر بحث مسئلہ سے بالکل غیر متعلق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین کی آبادکاری کے لیے اس میں ہل چلانا ناگزیر ہے، جس کے سر میں تھوڑی سی بھی عقل ہو وہ نہ اس بحث میں پڑ سکتا ہے کہ ہل کس نوعیت کا ہونا چاہیے اور نہ وہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ دیسی ہل چلانا چاہیے، اور انگریزی ہل یا ٹریکٹر سے زمین میں ہل چلانا ممنوع ہے۔

اگر ہم سر پر عمامہ باندھنے کی احادیث اور روایات کا یہ مطلب لیتے کہ "لازماً اسی طرز کی پگڑی باندھی جائے یا اُسی طرز کی ٹوپی پہنی جائے جو آج سے چودہ سو سال پہلے دورِ نبوی میں پہنی جاتی تھی، پگڑی کا رنگ اور طول و عرض بھی وہی ہونا چاہیے جو اُس عہد میں تھا"۔ تو اُن کا اظہارِ اختلاف معقول ہوتا۔ اس صورت میں وہ زمین میں ہل چلانے کی مثال دے کر یہ فرماتے کہ" ان احادیث سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو ننگے سر نہ رہنا چاہیے"، نہ کہ ایک مخصوص دور کی پگڑی ایک خاص وضع کے ساتھ سر پر باندھنے کا مطالبہ ہے، حالانکہ اس کے برعکس ہم نے ان احادیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے

کہ آدمی کو برہنہ سر نہ رہنا چاہیے۔ وہ اپنے دَور کے تمدنی اور مُلک کے موسمی حالات کے مطابق پگڑی، ٹوپی یا کسی اور چیز سے اپنے سر کو ڈھانپے۔ بالکل اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ان احادیث سے اسلامی تہذیب کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ "آدمی کو ننگے سر نہ رہنا چاہیے"۔

اس سلسلے میں حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ نے جو رویّہ اختیار کیا تھا اُس کی روح وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ سلف میں سے کسی نے بھی ہمیشہ ننگے سر رہنے کو پسند نہیں کیا۔ جس کو دین کے معاشرتی مزاج کا تھوڑا سا شعور ہو وہ یہ کہنے کی جسارت نہیں کرے گا کہ جس شخص کے سر پہ فلاں رنگ کی اور اتنی لمبی پگڑی نہ ہو اور اُس کے شملے کا طول اتنا نہ ہو اور اُس کے رکھنے کی جگہ فلاں نہ ہو وہ تارکِ سنّت اور گناہ گار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حضورؐ سے بہت زیادہ قلبی لگاؤ کی بنا پہ اسی طرح عمامہ باندھنے کو اپنے لیے پسند کرے اور اُسے مسنون قرار دے۔

فاضل تبصرہ نگار نے پیراگراف نمبر ۴ میں فرمایا ہے:-

"بالکل اسی طرح کا مسئلہ لباس کا بھی ہے۔ یہاں شریعت کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنا ستر ڈھانپے، اُس کا لباس ایسا ہو کہ موسم کی شدتوں سے محفوظ رکھے، اُس کی مالی حالت کے مطابق ہو اور اس کے انسانی شرف و وقار کے مناسب ہو۔ لیکن اس سے بڑھ کر شریعت ہمیں یہ نہیں بتلائے گی کہ ہم تہبند پہنیں یا شلوار، اور پاجامہ بہتر ہے یا پتلون، اور سر کو ڈھانپیں یا ننگا رکھیں اور یا پھر سر پہ ٹوپی رکھیں یا عمامہ، اور اس طرح قمیص پہنیں یا بش شرٹ، اور بازو کھلے ہوں یا بند، ان چیزوں میں شرعی حکم تلاش کرنا عبث ہے۔"

یہاں دو باتوں کو آپس میں خلط ملط کر کے جو نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے اسلام نے ایک ہدایت دی ہے کہ جسم کے نچلے حصّے کو ــــ ناف سے ٹخنوں تک ــــ برہنہ نہ رہنا چاہیے۔ اس ہدایت کو ملحوظ رکھ کر آدمی اپنے تمدنی اور موسمی حالات کے مطابق جو چیز بھی پہن لے جائز ہے، چاہے وہ پاجامہ ہو یا شلوار یا کوئی اور چیز۔ اسی طرح اسلام نے دوسری ہدایت یہ دی ہے کہ آدمی کو ننگے سر نہ رہنا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ کس چیز سے اپنے سر کو ڈھانپے تو اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ خدا جانے فاضل تبصرہ نگار نے سر پہ عمامہ باندھنے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تعامل اور کثیر روایات کے باوجود

یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ سر کو ڈھانپنے یا ننگے رکھنے کے متعلق شریعت نے کچھ نہیں بتایا۔

پیراگراف نمبر ۱۵ میں افعال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہماری بات کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ہم نے یہ فتویٰ تو نہیں دیا کہ ننگے سر رہنا حرام ہے اور جو شخص برہنہ سر رہتا ہے وہ فاسق ہے، اس بنا پر کہ وہ "واجب" کا تارک ہے۔ معلوم اور معروف بات ہے کہ "وجوب" اور "اباحیت" کے درمیان ایک اور درجہ بھی ہے جو "مندوب" کہلاتا ہے اس پر بھی "سنت" کا اطلاق ہوتا ہے۔

پیراگراف نمبر ۷ میں اُن کے استدلال نے عجیب رُخ اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "حضورؐ اور آپ کے صحابہ عمامہ باندھا کرتے تھے اور اُن روایات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ نے اُمت کو عمامہ باندھنے کی تلقین کی ہے یا سر ڈھانپے رکھنے کا حکم دیا ہے"۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول تو حجت ہے لیکن آپ کا فعل حجت نہیں ہے۔ حالانکہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے استدلال کیا جاتا ہے، اُسی طرح آپ کے افعال سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، بلکہ "تقریر" بھی حجت ہوتی ہے۔ "تقریر" کے معنی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو اور آپ نے منع نہ فرمایا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سر پر عمامہ باندھنے کے بارے میں جو احادیث اور روایات منقول ہیں، فاضل تبصرہ نگار کے نزدیک ان کی توجیہہ یہ ہے "صرف اتنی سی بات سے کہ حضورؐ یا آپ کے صحابہ عمامہ باندھتے تھے یا ٹوپی پہنتے تھے، لازم نہیں آتا کہ ننگے سر نہ رہنا چاہیے اور سر ڈھانپنا چاہیے۔ کیونکہ حضورؐ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ تم عمامہ باندھا کرو، معاشرت میں شریعت نے آزادی دی ہے، اس بنا پر اگر لوگوں نے ننگے سر رہنے کو اپنا عرف بنا لیا ہے تو یہ شرعی لحاظ سے مقبول ہونا چاہیے"۔

ان روایات کی یہ توجیہہ اور تاویل کسی امام، فقیہ و محدث نے اختیار نہیں فرمائی۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ننگے سر رہنے کی وبا مغربی تہذیب کی ایک لہر ہے، جس سے ہماری نسل متاثر ہو رہی ہے بلکہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ دانایانِ فرنگ نے ملتِ اسلامیہ سے انتقام لینے کے لیے جو اسکیم تیار کی تھی اور جس گہری سازش کی تخم ریزی کی تھی اب اُس کی فصل پک چکی ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اُن کی تہذیب نے ہمارے اجتماعی اور معاشرتی اداروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے،

مغرب سے نازل ہونے والی ہر بے ہودگی کو اب ہم شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کی سخت جانی بھی ایک حقیقت ہے، اس بنا پر فریقین کے درمیان شدید مزاحمت برپا ہے اور سرد جنگ بڑے زور سے چھڑی ہوئی ہے۔ اگر اسی طرح شریعت کے مزاج کی مرمت جاری رہی تو پھر مغرب کی بہت سی خرابیوں کو اباحیت کا لبادہ پہنانا پڑے گا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے شہروں میں نہ صرف یہ کہ مرد ننگے سر رہتے ہیں بلکہ خواتین نے بھی ننگے سر رہنے کو اپنا عرف بنالیا ہے۔ ہم اسلامی قوانین کی تدوین نہیں کر رہے اور نہ یہ بتاتے چلے ہیں کہ جو شخص ننگے سر رہے گا وہ فاسق و فاجر ہے اور جو شخص ایسا کرے اُسے اتنے کوڑے رسید کیے جائیں گے، بلکہ اسلام کے معاشرتی مزاج سے جو ہدایات ملتی ہیں، ہم اُن کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ یہاں مغربی تہذیب اب پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہو چکی ہے، قدیم روایات کو بڑی بے جگری اور تیز رفتاری کے ساتھ پامال کیا جا رہا ہے، آج کل ولیمہ اور دوسری تقریبات میں لوگ کھڑے ہو کر بلکہ چل پھر کر کھانا کھانے لگے ہیں، اس بدتہذیبی کو بھی استدلال کا اسلحہ دے کر مباح اور جائز ٹھیرایا جا سکتا ہے، بلکہ ٹھیرایا جا رہا ہے۔

ہمارے نزدیک ان احادیث کی صرف دو توجیہیں ہیں۔

ا۔ سر پر پگڑی باندھنا اور ٹوپی پہننا مسنون ہے۔ اس کی تائید حسبِ ذیل روایات سے ہوتی ہے،

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ۔ (مشکوٰۃ عن عمرو بن حریث بحوالہ مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی، آپؐ کے سر پر سیاہ پگڑی تھی اُس کا شملہ آپ نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا۔

اِس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ نے طیبی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:۔

جمعہ کے دن اچھا لباس پہننا اور سیاہ پگڑی باندھنا اور اس کے دونوں شملوں کو اپنے دونوں

لہ مرقاۃ المفاتیح جلد ۳ ص ۲۶۸۔

کا ندھوں کے درمیان لٹکانا مسنون ہے۔

وَقَدْ اَخْرَجَ اَبُوْدَاوٗدُ وَالْمُصَنِّفُ فِی الْجَامِعِ بِسَنَدِہِمَا عَنْ شَیْخٍ مِنْ اَہْلِ الْمَدِیْنَۃِ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ یَقُوْلُ عَمَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَدَلَہَا بَیْنَ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ۔

وَرَوَی ابْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ عَنْ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ اِنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَمَّمَہٗ بِعِمَامَتِہٖ وَاَسْدَلَ طَرَفَیْہَا عَلٰی مَنْکِبَیْہِ۔

وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ قَیْسٍ رَاَیْتُ ابْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا مُعْتَمًّا قَدْ اَرْسَلَہَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ وَقَدْ ثَبَتَ فِی السِّیَرِ بِرِوَایَاتٍ صَحِیْحَۃٍ۔ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُرْخِیْ عَلَامَتَہٗ اَحْیَانًا بَیْنَ کَتِفَیْہِ وَاَحْیَانًا یَلْبَسُ الْعِمَامَۃَ مِنْ غَیْرِ عَلَامَۃٍ فَعُلِمَ اَنَّ الْاِتْیَانَ بِکُلِّ وَاحِدٍ مِنْ تِلْکَ الْاُمُوْرِ سُنَّۃٌ۔[1]

مصنف نے جامع میں اور ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ اہل مدینہ کے ایک شیخ سے روایت کی ہے۔ اس نے کہا، میں نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنا عمامہ پہنایا اور اس کے شملے کو میرے آگے اور پیچھے لٹکایا۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنا عمامہ پہنایا اور اس کے دونوں شملے میرے کندھوں پر ڈال دیے۔

شرح السنۃ میں ہے: محمد بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو عمامہ

---

[1] مرقاۃ المفاتیح جلد ۸ ص ۲۵۰

باندھے ہوئے دیکھا ہے، انہوں نے اس کے شملے کو اپنے آگے اور پیچھے لٹکا رکھا تھا۔
سیرت اور تاریخ کی بہت سی روایات سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
بعض اوقات اپنی پگڑی کے شملے کو اپنے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا دیا کرتے
تھے اور بعض اوقات شملے کے بغیر بھی عمامہ پہن لیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا
کہ ان میں سے ہر طرز عمل مسنون ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ:۔

الف: جمعہ کے دن سیاہ پگڑی باندھنا اور اس کے شملے کو دونوں کندھوں کے درمیان لٹکانا مسنون ہے۔
ب: کسی رنگ کی تعیین اور طول و عرض کا لحاظ کیے بغیر پگڑی باندھنا اور اس کے شملے کو دونوں کندھوں کے درمیان لٹکانا مسنون ہے۔
ج: شملے کے بغیر عمامہ پہننا مسنون ہے۔

۲۔ آدمی کو برہنہ سر نہ رہنا چاہیے، وہ اپنے دور کے تمدنی اور موسمی حالات کے مطابق پگڑی یا ٹوپی پہنے یا کسی دوسری چیز سے سر کو ڈھانپے رکھے، اِلّا یہ کہ اُسے کوئی مجبوری ہو، یا سر پر پہننے کے لیے اُس کے پاس کوئی چیز نہ ہو۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس موضوع پر کوئی قولی حدیث مروی نہیں ہے لیکن فعلی احادیث تو موجود ہیں۔ شریعت کا مزاج اور رجحان معلوم کرنے کا ذریعہ صرف قولی احادیث نہیں بلکہ فعلی احادیث اور "تقریر" سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح حضورؐ کے اعمال و افعال[1] سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے۔ عمامہ کی روایات سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی کو برہنہ سر نہ رہنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ وہ سر پر کیا پہنے؟

ہمارے نزدیک شریعت نے اس طرح کی کوئی پابندی عاید نہیں کی کہ لازماً ٹوپی پہننی چاہیے یا پگڑی باندھنی چاہیے یا یہ کہ پگڑی خاص طریقے سے باندھی جائے۔ شریعت نے اس کے رنگ اور طول و عرض کی مقدار متعین کر کے گھٹن پیدا نہیں کی۔ بس صرف اتنا سا مطالبہ ہے کہ

[1] فصول البدائع فی اصول الشرائع للشیخ محمد بن حمزہ۔

اُسے کسی نہ کسی چیز سے اپنا سر ڈھانپنا چاہیے، اس کا انحصار آدمی کے ذوق، حالات اور موسم پر ہے، البتہ اس اصول کو لازماً ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ مسلمان کو مجموعی حیثیت سے لباس اور وضع قطع میں غیر مسلموں کی مشابہت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ مسلمان کو اپنے رہن سہن اور لباس میں وقار کے ساتھ رہنا چاہیے۔ سر ڈھانپنے میں جو وقار اور سنجیدگی ہے وہ برہنہ سر رہنے میں نہیں ہے۔

اسلام کے گذشتہ دَور میں —— جو کہ چودہ صدیوں پر محیط ہے —— مسلمانوں نے کبھی بھی چاہے وہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں، اس طرح ننگے سر رہنے کو عرف نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسے معیوب جانا گیا ہے، یہاں تک کہ کوئی نوجوان اپنے کسی بزرگ کے سامنے ننگے سر ہو کر آنے کی جسارت نہ کرسکتا تھا اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ معمر اور ڈاڑھی رکھنے والے دیندار بھی اس وضع کو اختیار کرتے ہیں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیے!

(۲)

مئی کے ترجمان القرآن میں جناب پروفیسر آسی ضیائی صاحب کے قلم سے میرے مضمون "ایک فراموش شدہ سنت" پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اسلامی تہذیب کے نقطۂ نظر سے انہوں نے بڑی مفید اور کھری باتیں کی ہیں۔ لباس اور حیا کے بارے میں انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے مضمون کا مرکزی موضوع بھی اسلامی تہذیب ہے، جس میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عہدِ حاضر کے نوجوانوں نے (بلکہ اُن کی دیکھا دیکھی بوڑھوں اور بچوں نے بھی) ننگے سر رہنے کی جس وبا کو قبول کیا ہے۔ (اور اب وہ خواتین میں بھی بڑے زور شور سے پھیل رہی ہے) اس کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کی معاشرت اور تہذیب کا جو عکس ہمیں دَورِ نبوی اور دَورِ صحابہ بلکہ سلف صالحین میں نظر آتا ہے اُس میں اس وبا کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم، صحابہ اور خیر القرون کی تمدنی زندگی میں سر کی پوشش کو خاص اہمیت حاصل تھی، بلکہ چودھویں صدی ہجری کے وسط تک اُمتِ مسلمہ کی تہذیب میں برہنہ سر رہنے کو سخت معیوب اور بے شرمی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

کلیسا کا نام لینے والوں نے سائنس اور عصری علوم کے بل بوتے پر مغرب میں مادر پدر آزاد تہذیب کو جنم دیا اور طویل عرصے تک پسماندہ اور منتشر قوموں کو غلام بنائے رکھا۔ آزادی کی تحریکیں چلیں اور کامیاب ہوئیں۔ اس کے نتیجہ میں بظاہر تو ہم انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گئے لیکن فی الواقع فکری، نظریاتی اور ثقافتی اعتبار سے ان کی غلامی سے ہم چھٹکارا نہ پا سکے بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کے زہر کو پینے کے لیے ہم سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہم زوال، پستی اور مرعوبیت کے دَور میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر معاملے میں مغرب کی طرف دوڑتے ہیں، اُس کی ہر ادا کی تحسین کرتے ہیں۔ وہ دل کو لبھاتی ہے تو پھر اُس کی نقل اُتارتے ہیں۔ جب ہماری ملّت کی اکثریت اُسے اپنا لیتی ہے تو اُسے نہ صرف یہ کہ ہم دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں بلکہ اُسے جائز اور برحق ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس ملّت کا کوئی فرد "ترقی کی اس نعمت" سے محروم نہ رہے۔ ننگے سر رہنے کی وَبا (بشرطیکہ وہ صرف مردوں تک محدود رہے) فرنگی تہذیب کا ایک چھوٹا سا مچھر ہے۔ جو ناک کے راستے ہمارے دماغ میں جا گھسا ہے۔ ہماری کشادہ ظرفی اور دریا دلی کا تو یہ عالم ہے کہ "گندی تہذیب" کے بڑے بڑے ہاتھیوں کو ہم نے اپنے دل و دماغ میں جگہ دے رکھی ہے اور لگتا ہے کہ کچھ عرصے تک اس بے حیا تہذیب کی بچی کھچی خرابیوں اور غلاظتوں کی سرپرستی بلکہ پرستش شروع کر دی جائے گی۔

محترم فاضل تبصرہ نگار نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ سر کی پوشش فقہی سے زیادہ تمدنی مسئلہ ہے اور میں نے بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر ہی سے اس پر بحث کی تھی۔ برہنہ سر نماز پڑھنے کا مسئلہ تو ضمناً آ گیا تھا۔ بعض دیندار اس مغالطے کا شکار ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنا مسنون ہے، اس بنا پر اُن کی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے عرض کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ

نے ہمیشہ سر ڈھانپ کر ہی نماز ادا کی ہے۔

حضورؐ نے زندگی میں ایک بار یا کسی صحابی نے کبھی کسی خاص مجبوری کی وجہ سے برہنہ سر نماز ادا کی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی عذر کے بغیر، ٹوپی وغیرہ میسر ہونے کے باوجود ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھنے کو معمول بنا لیا جائے اور اُسے مسنون بھی کہا جائے۔ حضورؐ نے ہمیشہ جس طرزِ عمل کو اختیار فرمایا، اُسے نظر انداز کر کے محض ایک آدھ موقع کی بات کو گرہ میں باندھ لینا اور ہمیشہ کے لیے اُسے معمول بنا لینا اتباعِ سنت کی کونسی قسم ہے؟

میرے نزدیک افضل اور اولیٰ یہ ہے کہ نماز سر ڈھانپ کر ہی ادا کی جائے، اگر کوئی شخص برہنہ سر ہو کر نماز پڑھتا ہے یا امامت کرتا ہے تو اُسے جائز کہا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض فقہا نے برہنہ سر ہو کر امامت کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔

اصل میں میرے سامنے معاملہ صرف برہنہ سر ہو کر نماز پڑھنے کا نہیں، بلکہ اُس کی پشت پر مغربی تہذیب کا ایک سیلاب ہے جس میں ہم سب تنکوں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر لوگوں نے ننگے سر رہنے کو عرف نہ بنا لیا ہوتا اور سر ڈھانپ کر رہتے اور پھر اُن میں سے کچھ لوگ ننگے سر ہو کر نماز پڑھ لیتے تو ہم اُس کا نوٹس نہ لیتے۔ یہ بالکل معمولی بات تھی۔ مگر چونکہ مغربی تہذیب آج کل پورے زور سے اسلامی تہذیب پر یلغار کر رہی ہے، اس وجہ سے موجودہ تناظر میں اگر برہنہ سر ہو کر نماز ادا کرنے گوارا کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سر کی پوشش کی اہمیت اسلامی تہذیب و تمدن کے دائرے سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جائے۔

مَیں یہ تو نہیں کہتا کہ جو شخص ننگے سر ہو کر نماز ادا کرتا ہے، اُس کی نماز جائز نہیں ہے لیکن یہ بات تو مَیں بڑے وثوق سے عرض کر سکتا ہوں کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے دور اور سلفِ صالحین کے عہد میں نہ صرف یہ کہ لوگ عموماً ننگے سر ہو کر نماز نہ پڑھتے تھے، بلکہ وہ عام حالت میں بھی سر کو ڈھانپے رہتے۔ لہٰذا یہ سنّت نبوی بھی ہے، سنّتِ خلفائے راشدین بھی۔ اور سنّتِ صحابہ بھی، لیکن "غیر حکمی" ہونے کی وجہ سے اسے ہم سنّتِ غیر مؤکدہ یا فعلِ مندوب کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس معاملہ میں دورِ رسالت میں عملاً کوئی بڑا انحراف

نمودار ہی نہیں ہوا، اس لیے قولی حکم و تاکید کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ از خود حضورؐ کے اختیار کردہ مسلک پر عمل ہوتا رہا۔

نوٹ: — جزئی مسائل پر بحث و تمحیص کو ان اوراق میں ہم زیادہ دور تک لے کے نہیں چل سکتے۔ اوّلاً مضمون ایک فاضل دینی استاد کا موصول ہوا تھا جسے شائع کرنے پر اختلافی نقطہ نظر سامنے آیا۔ تقاضائے دیانت کے تحت ہم نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کر دیا۔ اختتامی گفتگو کا حق اوّلین متکلم کو دینا ضروری معلوم ہوا۔ لہٰذا یہ مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اس مبحث کے تحت کوئی اور تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔

(ادارہ)

بقیہ عقل و وجدان سے متعلق چند اعتراضات کے جوابات

سیاحوں کے بیان کے مطابق ماسکو میں بدھ[1] کے روز لینن کی ممی کی زیارت کرنے والے مردوں اور عورتوں کا ہجوم ٹھیک اسی انداز سے ہوتا ہے۔ جس طرح ماضی میں مسیحیت کے ولیوں (SAINTS) کی قبروں پر ہوتا تھا۔ اسی طرح عجز و نیاز کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پہلے مسیحیت کے بزرگوں کے ساتھ عقیدت تھی۔ اب اشتراکیت کے بزرگوں کے ساتھ عقیدت ہے۔ تین چار نسلوں کی سخت جابرانہ ملحدانہ تعلیم و تربیت بھی حاسہ مذہبی کو فنا نہیں کر سکی۔ کیا اس کے فطری ہونے کا یہ واضح ترین ثبوت نہیں ہے؟ کیا یہ واقعہ انیسویں صدی کے ماہرین نفسیات اور فلسفہ طرازوں کی خوش گمانیوں کی زبانِ حال سے پُر زور تردید نہیں کر رہا ہے؟

---

[1] صرف ایک دن بدھ کو ہفتہ میں لینن کی ممی کی زیارت کی جاسکتی ہے۔

رسائل و مسائل

جسمانی اعضا کا عطیہ

سوال:۔ نمبر ۱۔ موجودہ سائنسی دور میں نظریات کی جنگ زوروں پر ہے۔ مختلف مادی نظریات اسلامی نظریات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے سائنسی تحقیقات پر مبنی جدید تکنیک کو موضوعِ بحث بنا کر اسلام کی نظریاتی عمارت میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور جب ان معاملات میں کوئی واضح مدلّل اور اطمینان بخش اسلامی نقطۂ نظر سامنے نہیں آتا تو یہ مادی نظریات عام فہم افراد کے دلوں میں جڑ پکڑ جاتے ہیں۔ میڈیکل سائنس سے متعلق اسی قسم کا ایک مسئلہ "طبی مقاصد کے لیے لاشوں کی چیر پھاڑ" اور "جسمانی اعضا کا عطیہ" ہے۔ جس سے متعلق ایک مضمون روزنامہ "جنگ کراچی" کی ۱۲ جنوری ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ یقیناً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ دوسری طرف اس سلسلے میں مولانا محترم رح کا نقطۂ نظر بھی آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس سلسلے میں کوئی واضح، مدلّل اور اطمینان بخش جواب دے سکیں تو نوازش ہوگی۔

نمبر ۲۔ جو لوگ مرنے کے بعد آنکھیں اور جسم کے دوسرے اعضا نکلواتے ہیں، تاکہ یہ دوسروں کے کام آسکیں یعنی بطور عطیہ دیتے ہیں۔ کیا یہ اسلام میں جائز ہے جب کہ یہ بھی ارشاد ہے کہ مُردے کو ہاتھ تک نہ لگاؤ۔

جواب:۔ آنکھوں کے عطیے کے مسئلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نفی میں ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے دلائل دیے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ اس مسئلے پر اہلِ علم کی کوئی مجلس غور و تحقیق کے لیے بیٹھتی اور کوئی متفقہ فیصلہ سامنے آجاتا، اخباری کالموں کی سطح پر جو بحث

کے جی میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے۔ دین کے استنباطی اور اجتہادی مسائل کے حل کا یہ کوئی موزوں میدان نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے سوال نچلی سطح پر پھیل گیا ہے۔ اور اس کے حق میں یا مخالفت میں دئے جانے والے دلائل بھی ٹینس کورٹ کی گیندیں بنے ہوئے ہیں۔

اجتہاد کے میدان میں دیکھنا یہی نہیں ہوتا کہ ایک خاص جزئی مسئلہ محض اپنی حد تک کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس مسئلے کے جواز کا دروازہ کھلنے سے اور کون سے دروازے کھول لئے ہوں گے۔ ہمارا معاملہ ایک ایسی تہذیب سے ہے جس کے سامنے انسان کی محض حیوانی اور بدنی زندگی ہے۔ اور آخرت کے تصور کا کوئی دخل نہیں۔ آج بحث آنکھوں کے مسئلے پر ہے، پھر گردوں کا مسئلہ اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر دل اور جگر کا قصہ چھڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر سائنس کی تحقیقات میں ایک کی کھال یا ہڈیوں کے ٹکڑے بھی دوسروں کو لگانے کا راستہ کھول دیں۔ اب نقشہ یہ بنا کہ ایک آدمی اِدھر مرا، اُدھر ہسپتالوں سے گاڑیاں اور ایمبولینس آگئیں اور مختلف ماہرین قطع و برید نے میت کے مختلف اجزاء کو کاٹ چھانٹ کر تھیلوں میں ڈالا اور ایک ادھوری سی لاش جسے مُردہ گوشت کا ڈھیر سمجھا جائے گا، باقی رہ جائے گی۔ اگر اسی بدن پرست تہذیب کو معیار بنانا ہے تو پھر سرے سے تکفین و تدفین کی ضرورت کیا رہے گی۔ کسی طرح تلف کر دیں، کیونکہ کسی تصرف کا کوئی تعلق آخرت سے تو ہے ہی نہیں۔

پھر جب یہ نقشہ احوال یوں بنے گا تو ایسا بھی ہوسکتا ہے بلکہ کثرت سے ہونے لگے گا کہ کوئی صاحبِ دولت ڈاکٹر کی مدد سے کسی جاں بلب مریض کا دل یا گردہ یا کوئی اور حصہ جلدی سے جلدی حاصل کرنے کے لیے بھاری رشوت دے۔ اسی طرح حادثات سے دوچار ہونے والوں کی جان بچانے پر جو پوری توجہ صرف کی جاتی ہے، اس کے بجائے اب نیا مقصد یہ اُبھر آئے گا کہ اس ایک شخص کو زندہ رکھنے کے لیے تو بے حد خرچ اور محنت کی ضرورت ہے اور پھر بھی یہ معذور ہی رہے گا۔ کیوں نہ اس کے اجزائے بدن سے کچھ اہم تر لوگوں کی زندگیاں بچالے اور ان کی قوتیں بہتر بنانے کا کام لیا جائے۔ اس طرح ہر قریب المرگ مریض یا حادثہ زدہ زخمی خطرے میں ہوگا کہ میرے ساتھ یا میری نعش کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

۱ خاص طور پر اس زمانے کی بعض نظریاتی مملکتوں کے شدید تعصبات کو سامنے رکھ کر (باقی بر صفحہ آئندہ)

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تو مفروضہ صورتیں ہیں، ایسا تو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ یقیناً آج آپ بکثرت ایسا نہیں دیکھ رہے (اگرچہ بعض منفرد عبرتناک واقعات ہوچکے ہیں) مگر جس راستے پر قدم رکھ رہے ہیں وہ ایسے ہی مناظر کی طرف جا رہا ہے۔ ان معاملات میں اللہ کا یہ قانون کام کرتا ہے کہ سنستدرجھم من حیث لا یعلمون۔ یعنی قدم بہ قدم تدریجاً حالات اس طرح بدلتے ہیں کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں پہلے عورتوں نے چادر، برقعے کے ساتھ گھروں سے نکلنا شروع کیا۔ پھر یہ استثنائی عمل معمول عام بن گیا، پھر برقعے سکڑنے لگے، پھر چادریں اُترنے لگیں، پھر آنچل بھی سروں پر بھاری ہوگئے۔ پھر لباس بھی بوجھ معلوم ہونے لگے۔ پہلے بات تھوڑی سی تعلیم حاصل کرنے تک تھی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھلے، پھر ملازمتوں کی اہمیت بڑھی، پھر مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور مخلوط ملازمتوں کا سلسلہ چلا، پھر مردوں کے دوش بدوش ہونے کا سلوگن سامنے آیا۔ کوئی بھی ذی شعور آدمی مزید آگے کی منازل کا اندازہ کرسکتا ہے۔

شاید آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ دُنیا میں زندوں ہی کا اغوا نہیں ہوتا، بلکہ قبریں اکھیڑ کر نعشیں نکال کر بڑے پیمانے پر بیچی جاتی ہیں۔ مقصد یہ کہ سائنس اور طب کی تحقیقات کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سائنس کے حوالے سے مریضوں یا حادثوں کا شکار ہونے والوں کے اعضا حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلے کے دو پہلو اہم ہیں۔

ایک یہ کہ کیا انسان کو اپنے جسم پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کے جن اعضا کو چاہے مفت یا قیمتاً دوسروں کے ہاتھ بیچتا پھرے۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) سوچیے کہ مبغوض اقلیتوں کا کیا حال ہوگا۔ مثلاً روس یا بھارت یا اسرائیل کے اکثریتی گروہ سے متعلق متعصب ڈاکٹر ایک مسلمان کی موت کے یقینی امکان کا فتویٰ دے کر اپنے گروہ کے مریضوں کو اُن کے گردے یا آنکھیں نکال دیں گے۔ ایسے ممالک کی جیلوں میں اقلیتی قیدیوں کے جسموں سے بھی ناجائز فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایسے واضح خطرات کے لیے خود اپنے ہاتھوں دروازہ کھولنا مناسب نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی میتوں کا احترام کیا تقاضا کرتا ہے۔

اس بارے میں شریعت کے پاس بہت سے احکام اور اشارات موجود ہیں۔ اُن کو ملحوظ رکھا جائے تو اعضا کے عطیات کا معاملہ ایسا کھلا نہیں رہتا کہ جس کا جو جی چاہے کرے۔

رہا یہ سوال کہ آنکھوں کی بینائی (ایک خاص صورت میں) لوٹانے کا جو طریقہ سائنس نے نکالا ہے، اس کے سامنے آنے کے بعد کیوں نہ مناسب کوشش کی جائے اور کیوں نہ اس کے راستے کھولے جائیں۔

مگر راستے اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر قلب کی شریانیں کسی دوسرے کی مدد کے بغیر آدمی کے اپنے ہی جسم سے بن سکتی ہیں تو ایک قرنیہ کا معاملہ ہی کیوں حل نہیں ہو سکتا۔ سائنس کو تھوڑی سی پیش قدمی اور کرنی ہوگی کہ وہ قرنیہ بنانے کا کوئی معقول طریقہ نکال سکے یا پلاسٹک وغیرہ سے مصنوعی طور پر بنا سکے[1]۔ علاوہ ازیں حیوانات کے قرنیے لگانے کی راہ بھی کھلی ہوئی ہے اور تجربات بھی ہوئے ہیں۔ اب اگر فی الوقت کچھ موانعات ہیں بھی تو ان کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ ہر مادی مشکل کا کوئی نہ کوئی مادی حل ضرور ہوتا ہے۔ یہ مادی کائنات کا قانون ہے۔

میرا منشا یہ ہے کہ انسانی اجسام اور میتوں کے تحفظ و احترام کو برقرار رہنا چاہیے، ورنہ یہ دروازہ کھل گیا تو سائنس کی چیرہ دستیوں کی کوئی حد نہیں ہوگی۔

ارشاداتِ رسالت پر ایک نظر چند ہی روز پہلے میں نے ایک صحابی کا واقعہ پڑھا جنہوں نے کسی جنگ میں زخمی ہو کر تکلیف کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو نقصان پہنچا لیا تھا۔ وہ شہید ہو گئے۔ خواب میں اُن کو کسی دوسرے صحابی نے دیکھا اور حضورؐ سے بیان کیا کہ وہ ایک جنتی محل میں تھے مگر ان کے ہاتھ اسی طرح خراب تھے۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے تمہیں جنت تو دے دی مگر جن ہاتھوں کو تم نے خود خراب کیا وہ اسی طرح رہیں گے۔ اس بات کو سن کر حضورؐ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ! ان کے ہاتھوں کو بھی ٹھیک کر دے۔

---

[1] اس وقت بھی آنکھوں کی پتلی کے سامنے لگے ہوئے شفاف پردے کو جو باریک تار ایک جگہ لٹکائے رکھتا ہے وہ جب ناکارہ ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ مصنوعی ریشہ استعمال ہوتا ہے۔

یہ چیزیں اگر سامنے ہوں تو آدمی اُخروی نقطۂ نگاہ سے بخوبی سوچ سکتا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہیے
اب احادیث پر بھی ایک نظر رہے۔

۱۔ خودکشی کے متعلق آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ بھی اسی اُصول پر ممنوع اور ناجائز ہے کہ آدمی کو اپنی زندگی یا جسم کا نقصان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۲۔ حضورؐ نے فرمایا: إِنَّ كَسْرَ عَظْمِ الْمُؤْمِنِ مَيِّتًا كَمِثْلِ كَسْرِ عَظْمِهِ حَيًّا
یعنی مومن کی میت کی ہڈی کو توڑنا ویسا ہی ہے جیسے زندہ ہونے ہوتے اس کی ہڈی کو توڑنا۔

۳۔ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم المثلة والمُثْلَة - (یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال کو توڑنے اور چہروں کو مسخ کرنے (کان، ناک وغیرہ کاٹ کر یا آنکھیں نکال کر) بگاڑنے سے منع فرمایا

یہ مسند امام احمد بن حنبل سے اخذ کردہ روایات ہیں۔ اِن سے آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا سمجھنا چاہیے اور بے جا نکتہ آفرینی نہیں کرنی چاہیے۔

مولانا مودودیؒ کا نقطۂ نظر ذیل میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت درج کی جا رہی ہے:-

> آنکھوں کے عطیہ کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا، بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور اُن کے دوسرے مفید استعمال بھی ہوسکتے ہیں یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہوجائے گا۔ اُس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اُس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ میں دینے کی وصیت کردے۔ جسم اس وقت تک اُس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے معاملے میں اسی کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رُو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کردیں۔
>
> اسلام نے انسانی لاش کی حُرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت

کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے۔ (جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے) انسانی کھال کو اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس یا منی پرس بنائے جاسکیں۔ (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ٹینری کر چکی ہے) انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی، حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دورِ وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضا نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۹۴ - ۲۹۵)

فقہا کا نقطۂ نظر

اب فقہا کا نقطۂ نظر بھی ملاحظہ فرمایئے جسے حافظ عبدالحمید صاحب نے مرتب کیا ہے:-

۱- فقہائے اسلام نے زندہ آدمی یا تازہ میت کے اعضا کی قطع و برید کو بالعموم ناجائز قرار دیا ہے حتیٰ کہ کوئی شخص اگر حالتِ اضطرار میں بھوکا مر رہا ہو اور کوئی شخص اسے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر کھانے کی اجازت دے تب بھی فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس اجازت سے فائدہ اٹھانا مضطر کے لیے مباح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی حالت میں اس کے لیے اکل میتہ اور اکل حرام بھی جائز ہو جاتا ہے۔

اسی طرح کسی زندہ حلال جانور کے جسم سے گوشت کاٹ کر کھانا بھی فقہا نے حرام قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حلال جانور بھی جب تک اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے حلال نہیں ہو سکتا۔

۲- مردہ حیوان کے اجزا سے استفادہ حالتِ اضطرار میں جان بچانے کے لیے جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان کی میت کو فقہائے اسلام نے اسی طرح قابل احترام قرار دیا ہے جس طرح کہ زندہ حالت میں اس کا احترام کیا جاتا ہے اور بغیر حق کے اس کا خون بہانا یا اسے جسمانی گزند پہنچانا جائز نہیں ہوتا۔

ایک حدیث میں بھی مذکور ہے کہ مُردہ انسان کی ہڈی توڑنا اسی طرح ہے جس طرح زندہ انسان کی ہڈی توڑنا۔

۳۔ جدید زمانے میں جس طرح اعضائے انسانی سے استفادہ کیا جا رہا ہے اس کو بھی بالعموم علمائے اسلام نے صحیح نہیں سمجھا۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ میں علماء کی ایک مجلس نے بھی اسے ناجائز قرار دیا تھا۔ ان کی رائے رابطہ عالم اسلامی کے مجلات میں شائع ہوئی تھی۔

انسانی زندہ یا مردہ اعضا کے کاٹنے اور ان کی پیوندکاری کو علما نے ناجائز قرار دیا ہے جہاں تک حیوانات کے اجزا یا بے جان اشیاء کو انسان کے جسم میں داخل یا نصب کرنے کا تعلق ہے اُسے بطور علاج و دوا جائز قرار دیا گیا ہے۔

۴۔ انسان جس طرح حین حیات اپنے یا کسی دوسرے کے جسمانی اعضا کو کاٹ کر استعمال میں نہیں لا سکتا، نہ دوسرے کو اس کی اجازت دے سکتا ہے، اسی طرح وہ اپنے اعضا کے اس طرح کے استعمال کی کوئی وصیت بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی وصیت کرے گا تو وہ بے معنی ہوگی۔ اگر زندگی میں وہ اپنے جسم کا مالک و مختار نہیں تو مرنے کے بعد اس کے بارے میں ہبہ یا وصیت کیسے کر سکتا ہے۔

۵۔ جان بچانے کے لیے مریض کو خون دینا جائز ہے[1]۔ لیکن اس میں اور اعضا کی پیوندکاری میں کوئی مماثلت نہیں۔ خون کی ایک خاص مقدار ہر صحت مند انسان کے جسم میں ہر وقت موجود رہتی ہے اور اس کا کچھ حصہ نکال لیا جائے تو اس کے لیے نہ کوئی جانی خطرہ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ کسی حصۂ جسم سے محروم ہو جاتا ہے۔ خارج شدہ خون کی اتنی مقدار پھر اس کے جسم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ جس صورت میں خون کا استعمال جائز ہے اس صورت میں اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔ اور چونکہ انسانی اجزا کی پیوندکاری جائز نہیں اس لیے اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں۔

---

[1] جس طرح لعاب دہن۔

مطبوعات

مرغزار | اشاعت خاص بیادِ ظفر علی خاں - ایڈیٹر: عبدالجبار شاکر استاد ادبیات اردو۔ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ۔

کالج کے اساتذہ اور طلبا کے اشتراک سے شائع ہونے والے ظفر علی خاں نمبر کا ہم دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی ہفت رنگ شخصیت نے ۱۸۹۵ء سے ۱۹۴۶ء تک کے دور میں ہمارے علمی و ادبی، صحافتی و خطابتی اور سیاسی و انتخابی دائروں میں گہرے اثرات چھوڑنے کے علاوہ شعر و شاعری کا ایک ایسا چمنستان آراستہ کیا جس میں تاریخی احوال نے وقتی پھول بھی کھلائے، مگر حقائق و معارف کے سدا بہار پھولوں کی بھی کمی نہیں۔

ایسی شخصیت کو فراموش کر دینا قومی نقصان ہے۔ خصوصاً نئی نسلوں کو آزادی سے پہلے کے سو پچاس کی اہم شخصیتوں اور ان کے کارناموں سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کا مجلہ مرغزار (ظفر علی خاں نمبر) اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت و سوانح کے متعلق مختلف نامور اصحاب کے دلچسپ مضامین شامل ہیں، نیز مولانا کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے، جس میں جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان، سقوطِ سمرنا، جنگِ عظیم اوّل، رولٹ ایکٹ، تحریک عدم تعاون، شدھی اور سنگھٹن، سائمن کمیشن، بھگت سنگھ، غازی امان اللہ، مجلس احرار، مجلسِ شہید گنج، اتحادِ ملت، فتنہ یہود، تحریکِ پاکستان، علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق بدیہہ گوئی کی حیرت انگیز مثالیں سامنے آتی ہیں۔ ملکی اور عالمی سیاست کا پورا پورا عکس مولانا کے کلام میں بھی موجود ہے اور ادارتی تحریروں میں بھی۔ ایک طرف انہوں نے برطانوی سامراج اور مغربی تہذیب کے خلاف معرکہ

جاری رکھا اور دوسری طرف ہندوؤں کی مسلم آزار ذہنیت سے ٹکراتے رہے۔ تیسرا میدان اُن کا قادیانیت تھی اور اس محاذ پر تو انہوں نے اتنی بوچھاڑ کی کہ آج بھی فضا میں گھن گرج باقی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے جہاں بیشتر نظمیں ارتجالاً لکھی ہیں وہاں اُن کی زمینوں کے انتخاب اور قافیہ و ردیف کے معاملے میں ایسی ایسی راہیں اختیار کی ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ پھر بات قافیہ پیمائی تک محدود نہیں، بلکہ ندرتِ مضامین، جذباتی گہرائی، تخیل کی بلندی اور تشبیہات و استعارات سے پورا حریم فن روشن ہے۔

ہم اس خاص نمبر کے مدیران، لکھنے والوں، اس کی ترتیب میں محنت کرنے والے طالب علموں، خاص نمبر کے مدیر اعلیٰ اور شیخوپورہ کالج کے پرنسپل صاحب کو اس نمبر پر مبارک باد پیش کرتے ہیں، کاش کہ یہ خاص نمبر پاکستانی تعلیم گاہوں اور دوسرے اداروں کی ہر لائبریری میں پہنچ جائے۔

MARVELLOUS STORIES FROM THE LIFE OF MUHAMMAD

انگریزی تالیف از MARDIJAH ALDRICH TARANTINO — ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن ۲۲۳ لنڈن روڈ لائسسٹر۔ یو کے۔ قیمت درج نہیں۔

سیرتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص واقعات کو (ابتدا سے فتح مکہ تک) بچوں کے لیے کہانی کے سے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، مگر حقائق کو مسخ نہیں ہونے دیا گیا۔ زبان نہ صرف آسان ہے بلکہ مغربی معیارات کے لحاظ سے وقیع ہے۔

مغربی ممالک میں دینی اسپرٹ کو آئندہ نسلوں میں زندہ رکھنے کے لیے ذی شعور اور درد مند مسلمانوں کے بعض ادارات بڑا گراں قدر کام کر رہے ہیں۔ ایک مخالف تہذیب کے ماحول میں بچوں کے لیے کہانیوں، نظموں اور معلومات کے دائرے میں اسلامی لٹریچر دستیاب نہ تھا۔ جو لٹریچر ملتا اور پڑھا جاتا تھا وہ یا تو لادینی نقطہ نظر کا آئینہ دار ہوتا یا پھر مسیحیت کے رنگ میں رنگا ہوتا، بلکہ صحیح یہ ہے کہ مغرب میں لادینیت اور مسیحیت نے آپس میں سازباز کر لی ہے۔ پس جو لٹریچر ملتا تھا وہ مسلمان بچوں کی ذہنی صحت کے لیے تباہ کن تھا۔ اب اسلامک فاؤنڈیشن لائسسٹر نے بچوں کے لیے مغرب کے لسانی اور ادبی اور فنی معیارات

کے مطابق اسلامی لٹریچر تیار کرنا شروع کیا ہے۔ متعدد چیزیں شائع ہو چکی ہیں، بعض کا تعارف ہم کرا چکے ہیں، بعض کا آئندہ کرائیں گے۔ یہ لٹریچر مغرب کے غیر مسلم بچوں اور کسی حد تک بالغوں میں بھی مفید مقصد ہو سکتا ہے، نیز پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں انگریزی زبان کے نصابیات میں، خصوصاً انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے والے کانونٹ سکولوں میں اسے رائج کیا جانا چاہیے۔ یوں بھی گھریلو سطح پر بچوں کے مطالعہ کے لیے ایسی کتابوں اور رسائل کا بہم کرنا ضروری ہے۔

تاریخ میلاد | از مولانا حافظ حکیم عبدالشکور صاحب مرزا پوری۔ ناشر: عمران اکیڈیمی مسلم آباد، شالامار ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: پونے دوسو۔ قیمت: ۲۰/- روپے

میلاد اور اس سے متعلق جو طور طریقے رائج ہیں اُن کے متعلق بڑی قیمتی تحقیق اس کتاب میں ملے گی۔ میلاد کی مجالس کا آغاز کب ہوا؟ سلام و قیام کا سلسلہ کب چلا، دوسری مختلف مضحکہ خیز رسوم کب، کہاں اس میں داخل ہوئیں؟ وغیرہ اُمور پر نہ صرف تاریخ بیان ہوئی ہے بلکہ ہر بات کے لیے دلائل اور حوالہ جات شامل ہیں، اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سچی خدا پرستی اور پیروی سنت اگر مطلوب ہو تو بہت سی مروجہ مذہبی تقاریب و رسوم کو کس طرح کسوٹی پر رکھنا چاہیے۔ ہمارے ان تمام خرابیاں اس ایک کوتاہی سے آتی ہیں کہ زندگی کے مختلف معاملات و امور میں کتاب و سنت کی سند پر انحصار نہیں کیا جاتا بلکہ ہم نے اپنی مذہبیت کے لیے کچھ اور ماخذ بھی بنا لیے ہیں۔

اس کتاب کو متلاشیانِ حق ضرور پڑھیں اور اس سے یہ رہنمائی بھی ضرور اخذ کریں کہ رسوم روایات کے جنگل میں جادۂ حق کو کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے۔

آداب الدعا | از مولانا محمد حنیف یزدانی صاحب۔ ناشر: مکتبہ نذیریہ، جامع مسجد قبا، جناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: ۲۰۰۔ قیمت: ۱۸/- روپے

دُعا خدا کی عبادت کا مغز اور جوہر ہے۔ قرآن کا افتتاح بھی دُعا سے ہوتا ہے اور اختتام

بھی دعا پر۔ جس نے صحیح طریق سے دعا کرنا سیکھ لیا، اُس نے اپنے ساری دین کی معرفت کا بنیادی دانہ پا لیا۔ اور جس کے دعا کرنے ہی میں توحید مجروح ہو گئی یا صحیح طرح رجوع الی اللہ پیدا نہ ہوا، یا خشوع و خضوع کی کیفیت نہ آئی وہ بڑی بڑی مرکب عبادات میں کیا کیا ٹھوکریں نہ کھائے گا۔

دعا قبول نہ ہو سکنے کے اسباب میں سے یہ بہت بڑا سبب ہے کہ صحیح طریق سے اور صحیح آداب کے ساتھ دعا نہیں کی جاتی۔ یزدانی صاحب نے اپنی کتاب میں صحیح اسلامی دعا کے آداب وضاحت سے بتاتے ہیں اور جو کچھ کہا ہے اس کے لیے دلائل اور حوالے دیے ہیں۔

اس قسم کے موضوعات کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، کیونکہ اس طرح تعصبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جدھر سے بھی کام کی بات سنائی دے اسے سنیں، اس پر غور کریں، دلائل کے لحاظ سے قرینِ حق ہو تو قبول کریں۔ کوئی فرقہ اور کسی فرقے کا لیڈر آخرت میں غلط روش کے نتائج سے کسی کو بچا نہ سکے گا۔

مؤلف سے بھی مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بعض مقامات پر ان کے انداز تحریر اور انداز تخاطب میں گروہی رنگ جھلکتا ہے۔ یہ اچھا نہیں۔ آپ سب کے لیے کتاب و سنت کی تعلیم کے داعی بنیں اور چیلنج اور طنز و تعریض کے انداز سے بچیں، نیز ایسی سرخیاں اور ایسے جملے استعمال نہ کریں، جن سے دوسری جانب تعصب کا داعیہ ابھر آئے۔

حسرتِ نعت | از پروفیسر آسی ضیائی۔ شائع کردہ ایوانِ ادب، اردو بازار لاہور۔ تعاون البلاغ لمیٹڈ۔ قیمت: ۱۰/- روپیہ

یہ کتابچہ تین نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے: معذرتِ نعت، دہائی، احتجاج۔ ان نظموں میں نعت کی بلندی اور شاعر کے احساسِ کوتاہی کا تذکرہ، آخری نظم میں قوم کے اس تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف حمد و ثنا و درود سے دلچسپی رکھتی ہے اور دوسری طرف عملی زندگی کو نعتِ رسولؐ سے ہم آہنگ کرنے پر تیار نہیں۔ یہ بڑی پیش پا افتادہ دردناک حقیقت ہے جسے آسی ضیائی صاحب نے خوبصورت اور پُرجوش انداز میں بیان کیا ہے۔ آسی صاحب کے ہاں

زبان کا تو خاص اہتمام ہوتا ہی ہے، اوزان اور قافیہ و ردیف کے لحاظ سے بھی ان کے تجربات بڑی قادرالکلامی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ان نظموں میں شعریت پوری شان سے موجود ہے، لیکن شاید بہتر یہ ہوتا کہ ان کے کسی موقر مجموعے میں یہ نعتیہ نظمیں چھپتیں، ایک پمفلٹ زیادہ دیر تک اپنے لیے جگہ نہیں بنا سکتا۔

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی از ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: پونے دو سو سے زائد۔ قیمت: ۲۷/- روپیہ

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحبِ مطالعہ و تحقیق ہیں۔ اس وجہ سے ان کی لکھی ہوئی ہر چیز دامنِ دل کھینچتی ہے۔ اُن کی یہ تازہ کتاب سامنے آئی تو بڑی خوشی ہوئی۔ یہ کتاب اُس موضوع سے تعلق رکھتی ہے جس پر پچھلے کچھ ہی عرصے میں متعدد کتابیں آچکی ہیں جن میں سے بعض بہت اچھی ہیں۔ یعنی پاکستان اور تحریکِ پاکستان سے متعلق۔

یہ کتاب ایک باقاعدہ تحقیقی کام کے طور پر نہیں لکھی گئی بلکہ ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ ہے جو اس موضوع پر ریڈیو کراچی نے ان سے لکھوائیں۔

اس کتاب کو پڑھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا کہ کیا کوئی صاحبِ علم و انصاف آدمی ضمیر زندہ ہوتے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ تاریخ بیان کرے تو اس کا کوئی باب بالکل القط کر دے یا کسی شخصیت یا تحریک کو سرے سے غائب کر دے۔ تاریخی مسخ و تحریف کا یہ عمل بڑے پیمانے پر برصغیر میں یوں ہوا کہ انگریزی دور میں تحریکِ مجاہدین کے تذکرے کو تاریخ سے خارج کر دیا گیا۔ پھر ہم نے مسلم لیگ اور پاکستان کے ایک اور مورخ کا کارنامہ دیکھا کہ انہوں نے سارے واقعات میں سے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کو یکسر خارج کر دیا ہے۔ اب اس نیکی کو ڈاکٹر معین الدین عقیل نے دہرا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں اور اربابِ علم و تحقیق میں اتنی بھاری غیر ذمہ داری کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا عذر یہ ہے کہ ریڈیو والوں کی طرف سے تحدید کی گئی تھی، اس پر سوال یہ ہے کہ ایسی تحدید کو قبول کیوں کیا جائے؟ کیا چند پیسوں کے لیے اور شہرت کے لیے؟ اور اگر یہ غلطی ہو ہی گئی تھی تو اس کی تلافی یوں بھی ہو سکتی تھی کہ تقاریر کو کتابی شکل میں مرتب

کرتے ہوئے ان میں مناسب اضافے کیے جاتے، نوٹ لکھے جاتے یا کم سے کم ایک ایسا مبسوط مقدمہ کتاب کے شروع میں لگا دیا جاتا جس میں کتاب کے گم گشتہ باب کو بیان کر دیا جاتا۔

مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر معین الدین عقیل جیسا صاف دل نوجوان ان دانشوروں کی سطح پر بھی جا سکتا ہے جو عمومی طور پر اسلامی دائرہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اس تعلق کو بہت بچ بچا کے جاری رکھتے ہیں کہ کسی دوسری جانب کے اجارہ دارانِ علم و ادب انہیں معقول آدمی سمجھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ صاحبِ احساس آدمی ہیں اور اشاعتِ آئندہ میں اس کوتاہی کی تلافی پر زور طریقے سے کر دیں گے۔

انہوں نے علماء کا تذکرہ کیا، ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ کیا، سیاسی لیڈروں کا تذکرہ کیا صحافیوں، خواتین، طلبہ کا تحریکِ پاکستان میں عنصر بیان کیا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ انہیں مولانا مودودی کی جگہ کسی صف میں دکھائی نہ دی۔ اردو کے اثر کو انہوں نے بیان کیا۔ اگر صرف لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا کا کیا ہوا کام بہت بڑا ہے۔ پاکستان کے لیے انہوں نے مسئلہ قومیت پر جو لکھا ہے آج کوئی محقق یہ دکھائے کہ اس سے بہتر کوئی علمی اور مؤثر کام کسی اور نے کیا تھا۔

ایسی کتابوں کو دیکھ کر ہماری گردنیں ان مستشرقین اور غیر ملکیوں کے سامنے جھکی رہ جاتی ہیں، جنہوں نے اپنی کتابوں میں پاکستان اور اس کی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں پر قلم اٹھایا ہے تو مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر بہت کچھ لکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ لکھنے میں بیشتر کا رنگ مخالفانہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں کا کوئی لکھنے والا بھی مخالفانہ انداز سے لکھ لے، مگر یہ ظلم تو نہ کرے کہ تاریخ کی وادی میں اگر ماؤنٹ ایورسٹ جیسا کوئی وجود موجود ہو تو وہ اسے قلمی جادو کے زور سے غائب کر دے۔

یہ کتاب خلوص و دیانت کے اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو کسی محقق، ادیب یا مصنف کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔

مسودات کی جانچ پرکھ کی ذمہ داری ناشر پر بھی آتی ہے۔

(بقیہ اشارات) یا جمال اور جاہ و جلال رکھنے والی کوئی خاتون خود آگے بڑھ کر خلوت میں دعوتِ گناہ دے اور وہ یہ کہہ کر اس دعوت کو رد کر دے کہ "اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ"۔

صالح نوجوانوں کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے بڑے ___ علم اور سرگرمی کار اور کردار میں بڑے ___ لوگوں سے با ادب رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اگر نوجوان اپنی پیش رو صفوں سے بے تعلق ہو جائیں اور علم و تقویٰ میں بڑے لوگوں سے استفادہ کرنے سے بے نیاز ہو جائیں تو وہ سعادت کا مقام مشکل ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

تو نوجوان اسلام کے بہترین خادم اور علمبردار اور دعوتِ حق کو پھیلانے والے سپاہی جبھی بن سکتے ہیں، جب اُن کا کردار اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ کی اسپرٹ سے بنا ہو۔ جوانی کی قوتوں کی تند موجوں کو ایمان و خودی سے مسخر کر لینا وہ کمال ہے جس کے نتائج بڑے بابرکت ہیں۔ لیکن اگر یہ تُند موجیں اخلاقی حدود سے اچھل کر باہر نکل جائیں تو ایسی غیر مسخر موجیں تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہیں۔

آٹھویں بات یہ کہ کسی بھی فرد یا گروہ کو دعوتِ حق اور اقامتِ دین کے سلسلے میں کوئی کام کرتے ہوئے اُن تمام عناصر کا خیال رکھنا چاہیے، جو دین کی علمبرداری کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سوچتے رہیں کہ کسی اقدام کا نتیجہ یہ تو نہیں ہوگا کہ سارے ہی کام کرنے والوں پہ بُرا اثر پڑے اور سبھی کی ساکھ مجروح ہو۔ ایک ہی مقصد کی راہ پر چلنے والے تمام قافلوں کے ساتھ ربط بھی ہونا چاہیے۔ اُن کے نقطہ ہائے نظر بھی سامنے ہونے چاہییں اور اُن سے ہم آہنگی بھی برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مختلف دائروں میں کام کرنے والی تنظیمیں اگر اسلام کی نسبت سے کام کر رہی ہوں تو ہر ایک کے اچھے اقدام کا اثر بھی اور غلط حرکات کا اثر بھی دوسروں پہ پڑتا ہے۔

داعیانِ حق کو یہ امر پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے۔

آخری اور نویں بات یہ کہ انتظامیہ میں بھی، صحافت اور ذرائع ابلاغ میں بھی، تعلیم اور پولیس

میں بھی، محکمہ خارجہ اور سی آئی ڈی میں بھی، سیاسی جماعتوں اور مذہبی جتھوں میں بھی جگہ جگہ اسلام کی ہمہ گیر انقلابی دعوت کے مخالفین بکثرت موجود ہیں۔ تمام وہ لوگ جو مفاد پرست ہیں، تمام وہ لوگ جو لادینیت پسند ہیں، تمام وہ لوگ جو مغرب پرست ہیں، تمام وہ لوگ جو اشتراکیت زدہ ہیں، تمام وہ لوگ جو خیانت کار ہیں، تمام وہ لوگ جو تفرقہ باز ہیں، وہ جہاں بھی بیٹھے ہیں، داعیانِ حق کے خلاف گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جونہی اِدھر کوئی کمزوری نمودار ہوتی ہے۔ وہ کسی بڑے اُصولی تقاضے کی بنیاد پر کسی نہ کسی محاذ سے بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

اپنا کام کرتے ہوئے چاروں طرف پھیلی ہوئی ان کمین گاہوں کا خیال رکھیے، جن میں دُوربینیں اور ہیڈ فون لگائے بڑے بڑے گھاگ آپ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت کا جائزہ لینے کے لیے بیٹھے ہیں، جہاں آپ ان کی زد میں آئے، وہ فائر کھول دیں گے۔

یہ تو ظاہر کی معاندانہ نگرانی ہے۔ آپ کی اصل توجہ تو خدا کی طرف سے مامور فرشتوں پر رہنی چاہیے جو آپ کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ اور اُن سے اُوپر خود اللہ تعالیٰ ہے جسے آپ کی چھپی نیتوں کا حال بھی معلوم ہے۔ آپ اگر ساری دُنیا کو بھی مغالطہ دے لے جائیں تو وہ خبیر و بصیر اصل مخفی حقیقت کو جانتا ہے جو سینوں میں مستور ہے۔ اگر نگاہ اِدھر رہے تو پھر معاشرے اور نظامِ وقت کی کمین گاہوں میں چھپے دشمنوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ان کا بس تو اسی وقت چلتا ہے جب ہمارا تعلق اپنے خدا سے کم ہوتا ہے۔

تو دوستو! فی الوقت یہ چند گذارشات پیشِ خدمت ہیں، ان پر غور کیجیے اور اپنے منصوبوں اور نقشوں کو درست کر لیجیے۔ ورنہ غلط کار اور کج کیش خادموں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرسکتا۔ اور وہ جب چاہے اپنے بنائے ہوئے قوانینِ تقدیر و تاریخ کے تحت ادنیٰ ادنیٰ دشمنوں سے انہیں پٹوا دیتا ہے۔ استغفر اللہ لی و لکم اجمعین۔

---

(۲)

ابلیس کی یہ کوشش اوّل روز سے انسانیت کے خلاف رہی ہے کہ وہ مرد و زن کے لباس اتروائے اور اُن کو عریاں کر کے ان میں فحش پسندی پیدا کرے۔ خدا کے مقدس انبیاء ایسی خدا پرستانہ تہذیب کے داعی رہے ہیں جس نے انسان کو لباسِ تقویٰ اور لباسِ شائستگی سے اپنے بدن ڈھانپنے کا پابند کیا۔ بخلاف اس کے دنیا میں جو بھی جاہلی یا مشرکانہ یا لادین یا مادہ پرست تہذیب اُبھری اس نے انسانوں کو، اور خاص کر عورتوں کو بے لباسی اور تنگ لباسی کی تعلیم دی تاکہ جنسی ہیجانات زور پکڑیں اور اعلیٰ اخلاقیات جڑیں نہ پکڑ سکیں۔

اس وقت جو لادین، مادہ پرست اور حیوانی تہذیب دُنیا کی بڑی طاقتوں نے انسانیت پر مسلط کر رکھی ہے اور جسے زمین کے چپے چپے تک پھیلانے اور دیہات اور قریوں کے جھونپڑوں میں پہنچانے کے لیے علوم، تعلیم، نصابیات، ادب، صحافت، ثقافتی ادارات، تصاویر اور مصور جرائد و رسائل، زیر زمین گندے ناولوں اور مکروہ تصاویر کی اشاعت، فلمیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی سی آر، موسیقی، آزادیٔ نسواں کی تحریکات، عورتوں اور اُن کی تصاویر کا کاروباری و تشہیری استعمال، مخلوط معاشرتی، ثقافتی اور تفریحی مجالس کا انعقاد، خواتین کی تقریبوں میں مرد عہدہ داروں کا پردھان بن کے بیٹھنا اور اُن میں انعامات تقسیم کرنا، بے پردہ اور اسلام کے اساسی تقاضوں سے بے بہرہ خواتین کا ملک کی عورتوں کی قیادت و نمائندگی کا ادعا کرنا۔ یہ سب ایسے مظاہر ہیں جو گواہی دیتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ اسلام دشمن قوتیں اس مہم میں دلچسپی رکھتی ہیں اور وہ پاکستانی معاشرے کے اسلامی رجحانات کو فحاشی کے سیلاب میں بہا لے جانا چاہتی ہیں۔ نیز اس مہم کی روز افزوں تیزی سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ خود انتظامیہ کے اندر ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کا فروغ چاہتے ہوں۔ کم از کم اتنا تو واضح ہے کہ اس سیلابِ بلا کی روک تھام کے لیے جو کارروائی حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے تھی وہ دس فیصد حد تک بھی نہیں ہو رہی۔

اندریں حالات میاں طفیل محمد (سابق امیر کالعدم جماعت اسلامی پاکستان) کی اس فیصلے

کا خیر مقدم ہر محبِ اسلام پاکستانی کرے گا کہ ماہ جون میں فحاشی کے خلاف سہ روزہ مہم چلائی جائے۔ فحاشی خلافِ اسلام ہے، قوم کے اخلاقی زوال اور نوجوانوں کی قوتوں کی تباہی کا باعث بنتی ہے، اس کا پھیلاؤ خدا کے غضب کو دعوت دیتا ہے، نیز یہ عین مقصدِ پاکستان کے لیے غارت گر ہے۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ کم سے کم توجہ دلائے جانے پر وہ انسداد فحاشی کو اپنا فریضہ سمجھے اور اس کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ پارٹ ادا کرے۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

علمائے دین! — علمائے طبّ — سنیئے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے — اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

اَلحمدُ لِلّٰہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبّی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے — اور

جامعہ طبیّہ اسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور ثانویہ یا موقوف علیہ سے فارغ ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اُصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵-جناح کالونی فیصل آباد

تفہیم القرآن

کی

مندرجہ ذیل سورتیں الگ چھپ کر آگئی ہیں

نمبر شمار	نام سورہ	قیمت
۱	تفسیر سورہ المائدہ	۱۰/- روپے
۲	〃 〃 الفرقان	۵/- 〃
۳	〃 〃 النساء	۱۴/- 〃
۴	〃 〃 التوبہ	۱۰/- 〃
۵	〃 〃 یوسف	۴/۷۵ 〃
۶	〃 〃 العنکبوت	۴/- 〃
۷	〃 〃 لقمان	۳/۷۵ 〃
۸	〃 〃 یٰسٓ	۳/۵۰ 〃
۹	〃 〃 الحجرات	۴/۲۵ 〃
۱۰	〃 〃 الفتح	۴/- 〃
۱۱	〃 〃 الحدید	۴/۷۵ 〃
۱۲	تفسیر سورہ الرحمٰن	۳/۷۵ روپے
۱۳	〃 〃 الاحزاب	۷/۵۰ 〃
۱۴	〃 〃 الصّف	۴/- 〃
۱۵	〃 〃 آلِ عمران	۱۰/- 〃
۱۶	〃 〃 الزمر	۴/۲۵ 〃
۱۷	〃 〃 المؤمنون	۶/۲۵ 〃
۱۸	〃 〃 الفاتحہ والبقرہ	۱۶/۷۵ 〃
۱۹	〃 〃 المنافقون	۲/۷۵ 〃
۲۰	〃 〃 پارہ اوّل	۶/۵۰ 〃
۲۱	〃 تیسواں پارہ	۲۰/- 〃

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور